

مجموعہ

تفاسیر ابو مسلم اصفہانی^{۲۷}

ترجمہ و تہذیب

سید نصیر شاہ

رفیع اللہ



جملہ حقوق محفوظ ہیں

مطبع : جمع شکر پرنٹرز

تاریخ اشاعت : ۲۰۰۶

قیمت : 140 روپے

فہرست مشمولات

44	ہاروت، ماروت کا قصہ	9	دیباچہ
50	ناخ منسوخ کی بحث	13	مقدمہ
89	اَمْ تَرْيُدُونَ کے مخاطب کون ہیں	24	ابو مسلم اصفہانی
90	سب سے بڑا ظلم	28	(1) سورة البقرہ
91	مشرق و مغرب اللہ کے ہیں	28	ایمان بالغیب
91	تحویل قبلہ	31	يَمْلِكُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ کا صحیح مفہوم
92	امت وسطیٰ	32	تقدیس
92	كُنْتُ عَلَيْهَا سے کیا مراد ہے	33	ظلم
93	ایمان ضائع نہیں ہوگا	33	قریہ سے کون سی بستی مراد ہے
93	حکم کا انتظار	34	حِطَّة کا صحیح مفہوم
94	خدا کا بندوں کو یاد کرنا	35	قول کی تبدیلی
94	شہد کی زندگی	36	استقنا
97	الَّذِينَ كَفَرُوا کا صحیح مفہوم	36	مصر سے مراد
97	کفر پر مرنے والے	38	ذلت و مسکنت
97	تخلیق ارض و سموات	38	رفع طور
98	کتمان حق	39	پتھر اور خشیت
98	اختلاف فی الکتاب کا صحیح مفہوم	39	اَمَّا نَبِيٌّ کا مفہوم
99	روزہ قے سے نہیں ٹوٹتا	41	یہود اور راسخوں کا فدیہ
99	حدود اللہ	42	قَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ کا صحیح مفہوم
99	آیات سے کیا مراد ہے	43	رسول اللہ کی آمد کا انتظار
100	اصلی نیکی	43	طویل زندگی کی لالچ

113	جبر و قدر	100	فتنہ کے معنی
113	ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندے	101	حج اور عمرہ
115	الحکمتہ	101	عقاب کا مفہوم
116	(2) سورۃ آل عمران	101	حج کے بعد تجارت کی اجازت
116	بالحق سے کیا مراد ہے؟	102	كَذٰلِكَ نَحْكُمُ اَبَاءَكُمْ سے کیا مراد
116	قرآن پہلی کتابوں کا مصدق ہے	102	شیطان کی دشمنی
116	محکمات اور متشابہات	103	دنیا کی زندگی
117	دُعا	103	اُمت واحدہ
118	خیل مسمومہ	104	حرمت کے مہینے
118	حجت بازی	105	انفاق فی سبیل اللہ
119	تہذیر	105	تُخَالِطُوهُمْ کے معانی
119	زکریا علیہ السلام	106	مشرک عورتوں سے نکاح
120	مریم کی سرپرستی	106	توبہ کا مفہوم
120	عیسیٰ علیہ السلام ہنگوڑے میں	107	اللہ کو قسموں کا نشانہ نہ بناؤ
121	عیسیٰ مثل آدم	108	مطلقہ عورت پہلے شوہر سے کب نکاح کر سکتی ہے
121	قرآن اور ولادتِ مسیح	109	وارث کی ذمہ داری
122	قصص الحق	110	بچے کا دودھ چھڑانا
122	التباس حق و باطل	110	مَا لَمْ تَمْسُوْهُمْ کا صحیح مطلب
123	میشاق الانبیاء	110	محسن مومن کو کہتے ہیں
124	انبیاء میں ”فرق“ کرنا	111	بٰلَکَ الرُّسُلُ کا پچھلی آیت سے ربط
125	مسلم کے معنی	112	روح القدس
125	تبیض وجوہ و تسود وجوہ کا مفہوم	112	اللہ کی ذاتِ زمان و مکان کی قید سے پاک ہے
127	خیبر الامم	112	کری

138	تمیں راتیں	127	اللہ کا اذن
138	مُتَكَبِّرِينَ فِي الْأَرْضِ	127	اللہ کا وعدہ
139	موسیٰ کا قوم کی طرف لوٹنا	128	کفار کا مرعوب ہونا
139	مثال	128	نبوت اور خیانت
141	(7) سورة التوبة	129	(3) سورة النساء
141	مشرکین اور مساجد	129	خلق منها زوجها کا مفہوم
141	امید	130	وراثت میں لڑکے اور لڑکی کا حصہ
142	کتاب اللہ	130	منافق اور مصیبت کا سامنا
142	استبزا	132	(4) سورة المائدة
143	قبولیت توبہ کی بشارت	132	نصیحت بھول جانے والے
143	شہادت	132	نقیب کے معنی
144	السائحون	132	غراب
144	ساعتِ عمرہ	133	رکوع
145	(8) سورة يونس	134	(5) سورة الانعام
145	الرزق کے معنی	134	”اجل“ اور ”اجل مسمی“
145	استوى على العرش	134	زمان و مکان
146	پکار	134	مستقر اور مستودع
146	مقامِ مرت	135	النَّارُ مَثْوَاكُمْ
147	(9) سورة هود	136	تیسری مخلوق
147	زفر	137	(6) سورة الاعراف
147	(10) سورة الرعد	137	شیطان، آدم اور حوا
147	محال کے معنی	137	رجفہ
148	(11) سورة ابراهيم		

159	امامت سے مراد	148	محمدؐ مغیل موسیٰ
160	الایذان علی سواء کے معنی	148	بینات
161	(16) سورة الحج	149	ثمرات
161	بے علمی	150	(12) سورة الکھف
161	غیظ	150	کتاب
162	وحی اور القائے شیطانی	150	(13) سورة مریم
164	کتاب	150	موالی
164	(17) سورة مؤمنون	150	رحم
164	کتاب ينطق بالحق	151	(14) سورة طه
164	شکر	151	اَنکاذ کا صحیح مفہوم
165	ذراء کم کا مطلب	151	صلوة سے روکنا
165	شقت کا مفہوم	151	قصہ سامری
165	رب العرش الکرم	156	سامری کا انجام
166	(18) سورة النور	156	زر قاکے معنی
166	آیات بینات	157	صفصفا کے معنی
166	نکاح کے معنی	157	ظلم و ہضم
166	واقعہ اُفک کا سب سے بڑا گناہگار	157	وسوسہ شیطانی
167	دنیاوی عذاب	157	قَالَ اَهْبِطْ اَمِیْنِیْہ اور جمع کی بحث
167	یَأْتِل کے معنی	158	مدِ عین
168	ہدایت اور نور	158	رزق
169	خلال	159	(15) سورة الانبیاء
169	(19) سورة الفرقان	159	رتق اور فتن
169	افترا	159	آگ سے خطاب

178	(25) سورة المجادلة	169	ظلم و زور
178	ظہار	170	قرآن کا نازل کرنے والا کون ہے؟
179	محارہ کا مفہوم	170	غفور رحیم
180	(26) سورة الملك	170	جنت الخلد
180	خدا کے متعلق کفار کا عقیدہ	171	قول رسول
180	یقولون کا اطلاق ماضی پر ہے	171	انبیاء کے دشمن
181	(27) سورة القلم	172	اصحاب الرس
181	کشف ساق	172	سبات
182	(28) سورة الحاقة	173	ظہیر کا صحیح مفہوم
182	الحاقہ کے معنی	173	اثام کے معنی
182	(29) سورة المعارج	174	(20) سورة القصص
182	تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ کا مفہوم	174	فراغ کا مطلب
183	(30) سورة الدهر	174	أَيَّمَّةٌ "يَدْعُو إِلَى النَّارِ"
183	نذر	174	مفتاح
183	(31) سورة المرسلات	176	(21) سورة الصّٰفّٰتِ
183	ظل	176	وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا کے معنی
184	(32) سورة النّٰزعات	176	(22) سورة الزمر
184	نَزَعَتْ کے معنی	176	أَرْضُ اللَّهِ
186	(33) سورة عبس	177	(23) سورة المؤمن
186	تیسیر	177	يَوْمَ الْآزِفَةِ کے معنی
186	(34) سورة الانفطار	177	(24) سورة الحديد
186	ابتدائی اور آخری عمر کے گناہ	177	جہاد اور اتفاق فی سبیل اللہ
187	(35) سورة التطفیف	178	إِرْجِعُوا کا مفہوم

187	قیامت کا بیان
187	حجاب
187	علیین کے معنی
188	(36) سورة الاعلیٰ
188	اسم کے معنی
188	(37) سورة البینہ
188	بینہ کا مفہوم
188	حقا کے معنی
189	(38) سورة التکاثر
189	کفار سے خطاب
189	(39) سورة الفیل
189	کَعَصِفَ مَا كُوِلَ کے معنی
190	(40) سورة الکواثر
190	فَصَلَ لِربِّکَ کا مفہوم
190	(41) سورة کفرون
190	لفظ ”ما“ کی بحث
191	(42) سورة اللہب
191	تَبَّتْ یَدَا کا مفہوم
191	حَمَّالَةَ الْحَطَبِ کا مطلب
192	(43) سورة الفلق
192	النَّفْثِ فِي الْعَقْدِ کے معنی

ویباچہ

”مجموعہ تفاسیر ابوسلمہ اصفہانی“ میں ابوسلمہ کے ان تفسیری اقوال کو یک جا کیا گیا ہے جو امام فخرالدین رازی نے تفسیر میں مختلف مقامات پر نقل کیے تھے۔ آج ابوسلمہ کی اصل تفسیر دنیا سے ناپید ہے، صرف یہی چند اقوال ہیں۔ جو تفسیر کبیر میں مل جاتے ہیں، انہی اقوال کو اردو زبان میں منتقل کروایا گیا ہے۔ جہاں ابوسلمہ نے دوسرے مفسرین سے اختلاف کیا ہے وہاں ہم نے مختصراً دوسرے مفسرین کے اقوال بھی پیش کر دیے ہیں تاکہ ایک عام قاری دونوں قسم کی آرا کو سامنے رکھ کر فیصلہ کر سکے۔ جہاں ابوسلمہ کے کسی قول میں اجمال تھا، وہاں ہم نے اپنی طرف سے اس کی تفصیل کر دی ہے تاکہ پڑھنے والے خلجان میں نہ رہیں۔

اس تفسیر کو محض ایک علمی ذخیرہ کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے ورنہ اس میں بیشتر ایسے مقامات ہیں جن سے ہمیں اختلاف ملے ہے۔ لیکن ہم نے اپنی آرا کو واضح نہیں کیا کیونکہ ہماری حیثیت نقاد کی نہیں مترجم کی تھی۔

اعتزال ایک ایسی فکری تحریک کا نام تھا جس نے اپنے زمانہ کی علمی سطح کے مطابق قرآن حکیم کی تفسیر پیش کی۔ زیر نظر کتاب کا مطالعہ کرتے وقت اس امر کو خصوصیت سے پیش نظر رکھنا چاہیے۔

مقدمہ میں اعتزال کی مختصر تاریخ اور معتزلہ کے عقائد بھی اجمالاً بیان کیے گئے ہیں۔ یہ چیزیں اس لیے ضروری سمجھی گئیں کہ معتزلہ جن کا کسی زمانہ میں ڈنکا بجتا تھا، آج تاریخ کا ایک گم شدہ باب ہیں، اور ان کے متعلق ہمیں بہت کم علم حاصل ہے۔ معتزلہ کے عقائد کے سلسلہ میں کہیں کہیں ”اشعریہ“ اور ”ماتریدیہ“ کا نام بھی آیا ہے۔ یہ دونوں کلامی مذہب ہیں۔ اول الذکر امام

ابوالحسن اشعری سے منسوب ہے جو پہلے معتزلی تھے، بعد میں سُنی اور شافعی ہو گئے۔ امام غزالی بھی اشعری ہیں اور احیائے علوم الدین میں انہوں نے اس مذہب کے اصول بڑی تفصیل سے لکھے ہیں۔ ”ماتریدیہ“ ابونصور ماتریدی سے منسوب ہیں۔ یہ اصل میں حنفیہ کا کلامی مذہب ہے۔ ابونصور و واسطوں سے قاضی ابویوسف اور امام محمد کے شاگرد تھے۔ علامہ ابن البیاضی کا قول ہے کہ ”اشعریہ“ اور ”ماتریدیہ“ پچاس مسائل میں باہم مختلف ہیں۔ ”ماتریدیہ“ اکثر مسائل میں ”معتزلہ“ کے ہم خیال ہیں۔ عقائد کو پڑھ کر آپ کو معلوم ہوگا کہ آج اکثر علمائے حنفیہ اشاعرہ ہی کے ہم عقیدہ ہیں حالانکہ قدیم زمانہ میں کسی حنفی کا اشعری ہونا بہت تعجب کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ علامہ ابن الاثیر تاریخ الکامل میں لکھتے ہیں:

”یہ نہایت عجیب بات ہے کہ کوئی حنفی کلامی مذہب میں اشعری ہو۔“

تفسیر کبیر میں سے ابومسلم کے بکھرے ہوئے اقوال جمع کرنا بڑا مشکل کام تھا۔ اس لیے ہو سکتا ہے کہ ہماری تمام عرقریزیوں اور جگر کا دیوں کے باوجود کوئی قول نقل ہونے سے رہ گیا ہو۔ بہر حال ہم نے امکان بھر کوشش کی ہے۔ جب ہم اقوال جمع کرنے کے بعد انہیں اُردو کا لباس پہنا چکے تھے تو اس وقت معلوم ہوا کہ کوئی ابوسعید انصاری صاحب ہیں جنہوں نے پہلے ان اقوال کو جمع کیا تھا۔ اگرچہ انہوں نے انہیں اُردو میں منتقل نہیں کیا تھا لیکن اقوال تو بہر حال یک جا تھے۔ اس لیے ہم نے اس کتاب کو تلاش کرنے کی بھی بڑی کوشش کی، تاکہ زیر نظر کتاب کو اس سے ملا کر دیکھ لیا جائے۔ ممکن ہے کوئی قول ہم سے چھوٹ گیا ہو؟ مگر افسوس ہے کہ وہ کتاب ہمیں نہ مل سکی۔

آخر میں ہم دوبارہ یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ کتاب کے ہر لفظ کے ساتھ مترجم کا متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا۔^۲

قرآن حکیم قیامت تک کے لیے رہنما ہے۔ اگر اس نے آج سے صدیوں پہلے یونانی فلسفہ کو شکست دی تھی تو آج یہ مغرب کی گمراہی فکر کے سیل بے پناہ کا مقابلہ کر کے اُس کا رخ بھی پھیر سکتا ہے۔ ہمارا ایمان ہے کہ انقلاب روزگار کی کوئی کروٹ اور فکری تبدیلی کی کوئی منزل ایسی نہیں جہاں قرآن ہماری رہنمائی نہ کرے:

نَر تو می خواهی مسلمان زیستن
 نیست ممکن جز بقرآن زیستن
 آن کتابِ زندہ قرآنِ حکیم
 حکمتِ او لایزال ست و قدیم
 فاش گویم آنچه در دل مضمراست
 ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
 مثل حق پنہاں و ہم پیدا است او
 زندہ و پائندہ و گویا است او
 صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست
 عصر ہا پیچیدہ در آفاتِ اوست
 چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
 جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
 بندہٴ مومن ز آیاتِ خداست
 ایں جہاں اندر بر او چوں قباست
 چوں کہن گردد جہانے در برش
 می دہد قرآن جہانے دیگرش
 یک جہانے عصر حاضر را بس است
 گیر اگر در سینہ دل معنی رس است

آیات کے ترجمہ میں شاہ رفیع الدینؒ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور محمد علی صاحب لاہوری کے تراجم سے استفادہ کیا گیا ہے۔ جہاں آیت کا حوالہ دیا گیا ہے، وہاں پہلے سورت کا نمبر ہے، پھر آیت کا نمبر۔ مثلاً 2: 102 کا مطلب ہے دوسری سورت کی آیت نمبر 102 آیات کے نمبر محمد علی صاحب لاہوری کے ترجمہ قرآن سے نوٹ کیے گئے ہیں۔

حواشی

1. ناشرین کو بھی۔ (ناشرین)
2. نہ ہی ناشرین کا۔ (ناشر)

اسلام دنیا میں امن و سلامتی کا پیغامبر بن کر آیا اور مذاہب باطلہ کے بیٹوں میں جکڑی ہوئی انسانیت نے لپک کر اس کو قبول کیا، لیکن گمراہی فکر اسلام کی اس مقبولیت کو دیکھ کر چٹکی نہ بیٹھ سکتی تھی۔ ابلیس نے بھی اپنے تخت کی عظمت کو بچانے کے لیے باطل پرستیوں کی صف و رصف فوجیں جمع کر دیں اور مسلمانوں کو شیطان کے خلاف چوکھی لڑائی لڑنا پڑی۔ کفر شمشیر بکف آیا تو حق کے سپاہی سینہ سپر ہو گئے اور باطل نے ضلالت فکر کے طوفان اٹھائے تو صداقت کے پرستاروں نے اُن کے مقابلے میں سر بفلک بند باندھ دیے۔

معزلہ

جب یونانی فلسفہ اور منطق نے اسلام کے خلاف صف آرائی کی تو مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جنہوں نے مخالفین کی اس فوج کو شکست دی اور علمی و فکری دنیا میں بھی اسلام کی عظمت کی دھاک بٹھادی۔ معزلہ سے پہلے اسلامی تاریخ میں کسی ایسے فرقہ کا سراغ نہیں ملتا جو ماوراء الطبیعی مسائل میں عقلی و علمی انداز سے زبان کھولتا ہو۔ معزلہ کو اس بارہ میں اولیت کا فخر حاصل ہے۔ کتنے علوم ہیں جو محض اس فرقہ کی وجہ سے عالم وجود میں آئے۔ کتنے عقائد ہیں جو آج تک ہم میں رائج ہیں مگر ہمیں یہ معلوم نہیں کہ کن لوگوں کی نکتہ بندیوں نے یہ دقیق نکات کھولے ہیں۔

اعتزال کی تاریخ

اسلام جب جزیرہ عرب میں رہا مسلمانوں کو فلسفہ و منطق سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ کیونکہ عرب کا اصلی مذاق فکر نہیں عمل تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صوم و صلوة اور حج و زکوٰۃ کے مسائل پر تو بہت کچھ تحقیق ہو چکی تھی لیکن ”ایمانیات“ سے متعلق کچھ زیادہ عرق ریزی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ اجمالی عقائد کافی سمجھے گئے تھے۔ لیکن جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہوا تو ایرانی، یونانی اور دوسری قومیں

اسلام کی حلقہ بگوش ہونے لگیں۔ ان لوگوں کے قدیم مذاہب میں خدا، صفاتِ خداوندی، قضا و قدر اور جزا و سزا کے متعلق خاص عقائد تھے۔ ان عقائد میں سے جو عقیدے صریحاً اسلام کے مخالف تھے ان کے مذہب کے اثرات تو ان کے دماغوں سے نکل گئے لیکن جہاں اسلامی عقائد کے کئی پہلو ہو سکتے تھے اور کچھ خیالات ان کے قدیم عقائد سے مشابہت رکھتے تھے، وہاں بالطبع وہ انہیں خیالات و افکار کی طرف مائل ہو گئے۔ مثلاً یہودیوں کے ہاں خدا کو مجسم تصور کیا جاتا تھا، جب وہ مسلمان ہوئے تو قدرتی طور پر وہ ان ہی آیات کو مددِ ایمان قرار دینے لگے جن میں اللہ تعالیٰ کی نسبت ہاتھ اور منہ وغیرہ کے سے الفاظ موجود ہیں۔ پھر یہ نو مسلم صدیوں سے فلسفیانہ موشگافیوں اور منطقیانہ نکتہ آفرینیوں کے عادی تھے اس لیے انہوں نے علمی مباحثوں کا سلسلہ جاری کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی نصرانی، زرتشتی اور یہودی علما نے جو فلسفہ و منطق سے واقف تھے مسلمانوں سے علمی مناظروں کا آغاز کر دیا۔ ایسے مناظروں کا گہوارہ عراق تھا کیونکہ وہاں مختلف قوموں کے لوگ جمع تھے۔ اب ایسے ایسے عقائد و معاملات میں گفتگو میں شروع ہو گئیں جن کے متعلق محدثین زبان تک ہلانا گناہ سمجھتے تھے۔ فی الواقع یہ وقت اسلام کے لیے بڑا ہی نازک وقت تھا۔ پھر جب سریانی، یونانی، پہلوی اور ہندی زبانوں سے حکمت و فلسفہ کی کتابیں عربی میں منتقل ہوئیں اور لوگوں میں فلسفیانہ مذاق پھیل گیا، تو جیسے سیلاب کا بند ٹوٹ گیا۔ قرآن کی آیات اور اسلامی عقائد کو غیر مسلموں نے ہدف بنا لیا اور اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔ محدثین اور فقہا صرف روایات کی مدد سے اس سیل بے پناہ کا مقابلہ کرنے نکلے، مگر یہ ان کا میدان نہیں تھا اور یہ ان کے بس کے بات نہ تھی کہ ان لوگوں کے اعتراضات کا جواب دے سکیں کیونکہ ان کا سارا علم منقولات تک محدود تھا اور مقابلہ بھی ان لوگوں سے آ پڑا تھا جو نہ قرآن کو مانتے تھے نہ احادیث کو۔ فکری گمراہی کا منہ زور طوفان حصارِ اسلام کی بنیادوں سے ٹکڑا رہا تھا۔ ان حالات میں ضرورت اس بات کی تھی کہ انہی لوگوں کے ہتھیاروں سے انہیں شکست دی جاتی اور اس کے لیے ضروری تھا کہ معترضین کے مذاہب اور ان کے فلسفہ سے پوری واقفیت ہوتی۔ الحاد کے اس ”سیلِ سبک سیرِ وز میں گیر“ کا مقابلہ کرنے کے لیے معترضہ میدان میں آئے۔ وہ حریفوں کے مقابلہ میں ہر طرح سے فائق تھے۔ انہوں نے اپنے زورِ بیان اور عقلی دلائل سے اعدائے اسلام کو شکست دی اور اپنے دور کے علوم

کے مطابق قرآن حکیم کی عقلی تفسیر پیش کر کے دشمنانِ اسلام کی زبانیں گنگ کر دیں۔

معتزلہ نے مختلف موضوعات پر کتابیں لکھ کر ملک کے اطراف و اکناف میں پھیلا دیں۔ اس طرح اسلامی فکر و دروازہ گوشوں تک پہنچ گیا۔ معتزلہ کو ایک فرقہ کی حیثیت بعد میں دے دی گئی۔ یہ درحقیقت وہ مسلمان تھے جو دین کو علیٰ وجہ بصیرت پیش کرنے کا جذبہ لے کر اٹھے تھے۔

جبر و قدر کے مسئلہ کو، اعتزال کا اولین مسئلہ سمجھنا چاہیے۔ ملوکیت میں عوام جن مظالم کا شکار تھے انہیں جائز ثابت کرنے کے لیے حکومت کی طرف سے یہ دلیل پیش کی جاتی تھی کہ انسان مجبور محض ہے۔ اُسے اپنے کسی فعل پر اختیار نہیں، جو کچھ وہ کرتا ہے اس کا ذمہ دار خود انسان نہیں ہے۔ کیونکہ ہر آدمی کی تقدیر لکھ دی گئی ہے۔ سب سے پہلے معبد جنہی نے اس مسئلہ کی تردید کی اور انسان کو اپنے افعال پر مختار تسلیم کیا۔ اس طرح مذہبِ قدر کی بنیاد پڑی۔ معبد علانیہ حکومت کی مخالفت کرتا تھا، اس لیے عبدالملک بن مروان نے 80ھ میں اُسے حجاج کے ہاتھوں قتل کرادیا۔

معبد کے بعد غیلان دمشقی نے اس مذہب کو اپنایا۔ اور چند اور مسائل بھی مذہبِ اعتزال میں شامل کر لیے جن میں سے امر بالمعروف کا مسئلہ حکومت کے لیے انتہائی پرخطر مسئلہ تھا، آخر ہشام بن عبدالملک نے 105ھ میں اُسے دمشق بلا کر پھانسی دے دی۔

لیکن مذہبِ اعتزال کو اب سینکڑوں لوگ قبول کر چکے تھے اور اس کے اصول بھی مرتب ہو گئے تھے۔ 80ھ میں عمرو بن عبید اور واصل بن عطا پیدا ہوئے جنہیں مذہبِ اعتزال کا رکن رکین کہنا چاہیے، دونوں صاحبِ فضل و کمال تھے۔ ان کی نکتہ آفرینیوں سے اعتزال کو بہت عروج ملا حتیٰ کہ یزید بن ولید بن عبدالملک نے علانیہ یہ مذہب قبول کیا۔ جب ولید بن یزید عیاشیوں میں ڈوب گیا تو یزید نے مذہبِ اعتزال کے پانچویں اصول امر بالمعروف پر عمل پیرا ہو کر بغاوت کا علم بلند کیا۔ اور ہزاروں معتزلہ اُس کے ساتھ ہو گئے۔ ولید قتل ہو گیا اور یزید کو فتح حاصل ہوئی۔ اب گویا اعتزال کے قدم تختِ سلطنت پر بھی پہنچ گئے۔ 132ھ میں خلافت بنو اُمیہ کا خاتمہ ہو گیا۔

عباسی خاندان کا دوسرا بادشاہ منصور اگرچہ کسی مذہب سے منسوب ہونا نہیں چاہتا تھا

لیکن چونکہ عمرو بن عبید اس کا بچپن کا ساتھی تھا، دونوں نے ایک مدت تک اکٹھی تعلیم حاصل کی تھی، اس کے علاوہ وہ عمرو بن عبید کی حق گوئی، جرأت ایمانی اور زہد و قناعت کا بھی معترف تھا، اس لیے اس کے زمانہ میں معتزلہ کو بہت عروج حاصل ہوا۔

منصور کے بعد مہدی نے مذہبی آزادی کو روک دیا۔ اس کے بعد ہارون الرشید تخت نشین ہوا۔ وہ خود تو فلسفہ و حکمت سے ناواقف تھا لیکن دربار برائے کے ہاتھ میں تھا۔ اس لیے اعتزال کو عروج نصیب ہوتا گیا۔ ہارون کے بعد مامون آیا تو معتزلہ کی بن آئی، کیونکہ اُس نے خود یہ مذہب قبول کر لیا۔ مامون خود بھی بہت بڑا فاضل تھا اور ابوالہذیل و نظام جیسے آفتاب و ماہتاب بھی اُس کے دربار میں موجود تھے۔ اس لیے اعتزال کا مہر اقبال نصف النہار پر چمکنے لگا۔ نظام کے بعد اُس کے فاضل شاگرد جاحظ نے بھی مذہب اعتزال کو بہت وسعت دی۔

مامون کے بعد معتصم اور واثق یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ وہ دونوں معتزلی تھے۔ مشہور معتزلی احمد بن داؤد ان کے زمانہ میں قاضی القضاۃ رہے جنہیں ایک واسطہ سے واصل بن عطا کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔ ان کے زمانہ میں اعتزال کو اور زیادہ قوت حاصل ہوئی۔

واثق کے بعد متوکل نے عقلی و فکری ترقی کو روک دیا لیکن چوتھی صدی ہجری تک اس مذہب کو پوری قوت حاصل رہی۔ بڑے بڑے متکلم، مفسر اور ادیب پیدا ہوئے۔ سب سے آخر میں بوعلی جیائی تھے، ان کے بعد کوئی بلند پایہ امام الاعتزال پیدا نہ ہوا۔

علامہ بشاری نے چوتھی صدی ہجری میں دنیا کا سفر کیا تھا انہوں نے درج ذیل مقامات میں معتزلہ کی نسبت یہ تفصیل لکھی ہے:

”سرواۃ اور حرین کے سوا حل اور خصوصاً عمان کے تمام باشندے معتزلی ہیں۔ عراق میں حنبلیوں اور شیعوں کا غلبہ ہے تاہم معتزلہ بھی موجود ہیں۔ رقوق کے موضع عانتہ میں معتزلہ کی کثرت ہے۔ فسطاط میں معتزلہ کا بڑا زور ہے، خراسان کے دیہات میں بھی ان کی کثرت ہے۔ فارس اور سیرجان میں اکثر معتزلہ ہیں۔ کرمان میں تمام دنیا کی

نسبت معتزلہ زیادہ ہیں۔“

چوتھی صدی ہجری میں ہی معتزلہ پر ہولناک مظالم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ محمد بن احمد (متوفی 478ھ) جو بہت بڑے معتزلی عالم تھے پچاس سال تک گھر سے نہ نکل سکے۔ علامہ زنجیری جن کی تفسیر کشاف گھر گھر پھیلی ہوئی ہے، معتزلی ہونے کی وجہ سے ملک میں چین سے نہ رہ سکے اور مجبوراً مکہ چلے گئے۔

ساتویں صدی ہجری میں مغلوں اور ترکوں نے بغداد اور دوسرے بڑے بڑے شہروں کو تباہ کر کے مسلمانوں کی علمی و عقلی قوتوں کا بھی استیصال کر دیا اور اعتزال جیسا نازک مذہب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ ترک قلم کے بجائے تلوار کے دھنی تھے اور اعتزال جیسے دقیق مذہب کو قلم سے زیادہ مناسبت تھی، اس لیے ترکوں کے مسلمان ہو جانے کے بعد یہ مذہب بھی زندہ نہ ہو سکا۔

معتزلہ کے عقائد

معتزلہ کے اجمالی تعارف کی یہ کوشش ناکام رہے گی اگر مجمل طور پر ان کے عقائد بیان نہ کیے جائیں۔ معتزلہ کے عقائد میں یہ اصول سبایات کی حیثیت رکھتے ہیں:

- 1- توحید
- 2- عدل
- 3- قدر
- 4- وعدہ و وعید
- 5- المنزلۃ بین المنزلتین
- 6- امر بالمعروف

توحید

اگرچہ مسلمانوں کے تمام فرقے اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک تسلیم کرتے ہیں مگر پھر بھی خدا کے تصور میں اختلافات رہے ہیں اور آج بھی موجود ہیں۔

ظاہر یہ اور مشہور ہے کہ اللہ جسمانی ہے، عرش پر متمکن ہے، اُس کے ہاتھ ہیں، چہرہ ہے۔ سرور کائنات کے دوش مبارک پر اللہ نے ہاتھ رکھا اور آپؐ نے اُس ہاتھ کی ٹھنڈک محسوس کی۔

عام ار باب روایت کے نزدیک خدا جسمانی ہے، اُس کے ہاتھ ہیں، منہ ہے، پنڈلیاں ہیں، لیکن یہ سب چیزیں ایسی نہیں جیسی ہماری ہیں۔ وہ عرش پر بیٹھا ہے، کرسی پر پاؤں رکھے ہیں

اور کرسی ان کے بوجھ سے چرچراتی ہے۔

معترکہ کے نزدیک خدا کی ذات زمان و مکان کی قید سے ماوراء ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے، کوئی جہت نہیں جس کی طرف اشارہ کر کے کہا جاسکے کہ خدا اس طرف ہے۔ وہ مجسم نہیں ہے۔ قرآن میں جہاں اُس کے ہاتھ اور چہرے کا ذکر آیا ہے، وہاں حقیقت نہیں بلکہ مجاز مراد ہے۔ کسی زمانہ میں اس قول کو کفر کا ہم پلہ خیال کیا جاتا تھا لیکن آج غالباً سب ہی لوگ اس قول میں معترکہ سے متفق ہیں۔

صفات

توحید کے ساتھ ہی مسئلہ صفات کا تعلق ہے۔ مدتوں یہ مسئلہ باعث نزاع رہا کہ:

ہیں صفات ذات حق، حق سے جدا یا عین ذات

محدثین اور فقہاء کا عقیدہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات اس کی ذات سے الگ اور قدیم ہیں۔ معترکہ کہتے تھے کہ اس طرح تو بہت سے خدا ہوئے اور تعدد لازم آیا۔ پھر ذات اور صفات کی علیحدگی میں ایک اور مشکل بھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر صفات ذات سے الگ ہوں تو کسی صفت کی غیر موجودگی میں بھی ذات باقی رہتی ہے۔ جیسے انسان کے صفات میں اگر صفت سماعت موجود نہ ہو تب بھی اُسے انسان کہا جائے گا۔ لیکن اگر خدا (فرض کرو) صفت خالقیت سے محروم ہو تو اُسے خدا نہیں کہا جاسکتا۔ یہی وہ دلائل تھے جن کی بنا پر معترکہ صفات ذات عین ذات سمجھتے تھے۔ وہ اس کے استدلال میں وہ آیات پیش کرتے تھے جن سے تنزیہ ثابت ہوتی تھی۔

عدل

توحید کے بعد۔ یہ اُن کا دوسرا عقیدہ تھا۔ تمام اسلامی فرقے بحیثیت مجموعی خدا کو عادل تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن خیر لہ اس سلسلہ میں چند خاص تشریحات سے کام لیتے تھے۔

اشعریہ کا عقیدہ تھا کہ خدا محالات کا حکم دے سکتا ہے اور دیتا ہے لیکن معترکہ اس کے مخالف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ محالات کا حکم دینا عدل خداوندی کے خلاف ہے اور جب خدا عادل تسلیم نہ کیا جائے تو لا محالہ اُسے ظالم کہنا پڑے گا اور یہ اللہ کی شان کے خلاف ہے۔ ماتریدیہ بھی اس معاملہ میں معترکہ کے عقائد سے متاثر ہیں۔

اشعر یہ یہ بھی کہتے تھے کہ کوئی چیز فی نفسہ نہ اچھی ہے نہ بُری، خدا جس چیز کو اچھا کہہ دے اچھی ہے جسے بُرا کہہ دے بُری ہے۔ اس کے برخلاف معتزلہ کا خیال تھا کہ خدا اسی چیز کو اچھا کہتا ہے جو اصل میں اچھی ہو اور اسی کو بُرا کہتا ہے جو اصل میں بُری ہو۔ ماترید یہ نے معتزلہ کا یہ عقیدہ بھی قبول کیا ہے۔

اشعر یہ کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدا کے لیے عدل و انصاف کرنا ضروری نہیں۔ وہ چاہے تو عبادت کے عوض عذاب دے دے اور چاہے گناہ کے بدلہ میں انعام دے دے۔ معتزلہ اس نظریہ کے بھی سختی سے مخالف ہیں، اور ان کا عقیدہ ہے کہ عدل و انصاف خدا کے لیے ضروری ہے۔ عبادت کے عوض عذاب اور گناہ کے عوض انعام دینا ظلم ہے۔ اور خدا ظلم نہیں کر سکتا کیونکہ ظلم نقص بشریت ہے اور اللہ نقائص سے پاک ہے۔ ماترید یہ نے بھی اسی عقیدہ کو اپنے مذہب میں شامل کر لیا۔

قدر

انسان اپنے افعال میں مجبور محض ہے یا مختار مطلق؟ یہ سوال اُس وقت سے انسانی ذہن کے لیے وجہ اضطراب بنا ہوا ہے جس وقت سے اُس نے سوچنا شروع کیا ہے۔ مذہبی نقطہ نظر سے غور کیجئے تو مسئلہ میں کسی قسم کی پیچیدگی نہیں۔ جب اللہ تعالیٰ نے انسانی افعال کی جزا و سزا مقرر کر دی ہے تو لازماً انسان مجبور نہیں، کیونکہ مجبور کو سزا دینا خدا کی صفتِ عدل کے خلاف ہے۔ آخر کیسے جائز ہے کہ کسی آدمی کو خود ہی چوری کرنے پر مجبور کرے اور پھر اُسے چوری کی سزا بھی دے۔ اگر عقیدہ جبر کو تسلیم کیجئے تو قیامت اور حشر نشر سب عقائد بے معنی ہو جاتے ہیں۔ اس واضح بات کی بنا پر معتزلہ نے قدر کا راستہ اختیار کیا ہے اور انسان کو اپنے افعال میں مختار تسلیم کیا ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں بعض ایسی آیات بھی ہیں جنہیں اگر سرسری نظر میں دیکھا جائے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ انسان کے افعال بھی اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور انسان مجبور ہے۔ معتزلہ ان تمام آیات کا یہ جواب دیتے ہیں کہ انسان کو چونکہ تمام قوتیں اللہ نے عطا کی ہیں۔ اس لیے ان افعال کی نسبت اللہ کی طرف جائز ہے جیسے ہم یہ کہنے کی بجائے کہ ”سورج کی گرمی گندم کے خوشوں کو پکاتی ہے۔“ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ”اللہ گندم کے خوشوں کو پکاتا ہے۔“ بعض آیات میں ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ نے کفار کے

دلوں پر مہریں کر دی ہیں اور وہ حق پر غور نہیں کر سکتے تو گویا اللہ نے انہیں کفر پر مجبور کر دیا ہے۔ معترض کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے ہر فعل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ مرتب ہوتا ہے۔ انکار و جحود اور ضد و سرکشی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کے کان حق کی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتے اور اُس کا ذہن صداقت کی دعوت پر غور و فکر نہیں کرتا۔ پس ختم قلوب اصل میں انکار و جحود کا لازمی نتیجہ ہے۔ اور اس کے باوجود انسان کو اختیار ہے کہ وہ دعوت حق و صداقت پر فکر و تدبر کر کے اپنے دل کے قفل کھول دے۔ گویا جہاں ضد کے فعل کا نتیجہ ختم قلب ہے، وہیں ضد چھوڑ دینے کا یہ نتیجہ بھی تو ہے کہ انسان میں حق قبول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آخراً یہ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أُنْذِرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ. خَتَمَ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِهِمْ وَعَلَى سَمْعِهِمْ وَعَلَى أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةً کے نزول کے بعد بھی تو کفار ایمان لاتے رہے ہیں۔ پس اگر اس کا وہی مفہوم ہوتا جو جبر یہ لیتے ہیں تو پھر وہ لوگ بعد میں ایمان کیونکہ لاتے جب کہ اُن کے دلوں پر مہریں لگ چکی تھیں۔ فی الواقع ایسی تمام آیات کا مفہوم یہی ہے کہ جب تک کفار ہٹ دھرمی اور ضد پر جبر ہیں حق اُن پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ اور اُن کی تقدیر یہی ہوتی ہے کہ ان کی بصارت پر باطل پر دے تان دیتا ہے اور نظام حق کے تابناک نتائج دیکھ نہیں سکتے۔ لیکن جب وہ اپنی حالت بدل لیں، ضد اور ہٹ دھرمی چھوڑ دیں تو ظاہر ہے کہ اس فعل کے بُرے نتائج بھی خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔ گویا انسان اپنی حالت بدل لے تو اُس کی تقدیر بھی بدل جاتی ہے۔

رمز بار کیے بحر فی مضر است	تو اگر ویر شوی او ویر است
شبنمی! فتنگی تقدیر تست	قلزمی! پائندگی تقدیر تست
خاک شو نذر ہوا سازد ترا	سنگ شو بر شیشہ اندازد ترا

وعدہ و وعید

معترض کہ کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جس عمل کے لیے جو وعدہ، وعید بیان کی گئی ہے اُس کا نافرذ ہونا ضروری ہے۔ محض ڈراوے یا ترغیب کے لیے خدا کچھ نہیں بیان کرتا۔ نہ وہ ”موج میں آکر“ انسان کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور نہ غصہ میں آکر فرمانبردار یوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ ہر عمل کا نتیجہ مقرر ہے اور وہ مرتب ہو کر رہے گا۔ اشعر یہ اس کے مخالف ہیں۔

معتزلہ سے پہلے گناہ کبیرہ کے مرتکب کو اہل روایت کا فر کہتے تھے اور مرجیہ اسے مسلمان سمجھتے تھے۔ معتزلہ نے کہا وہ نہ مؤمن ہے نہ کافر بلکہ اس کی حالت ان دونوں کے بین بین ہے۔ اسے فاسق کہا جاسکتا ہے۔

أمر بالمعروف

خوارج اس اصول کو فرض عین قرار دیتے تھے اور ہمیشہ شمشیر بکف رہتے۔ لیکن معتزلہ اسے فرض سمجھتے تھے۔ وہ تلوار اٹھانا اُس وقت ضروری سمجھتے جب حالات سازگار ہوتے اور سارے سامان جمع ہو جاتے۔

عقل کا غلبہ

معتزلہ عقل کی فضیلت کے قائل تھے۔ وہ عقل کو احادیث پر حاکم سمجھتے تھے۔ جو حدیث عقل و درایت کے خلاف ہوتی اُسے موضوع قرار دیتے۔ اس اصول کو وضع کرنے کا بڑا سبب غالباً اُن لوگوں کا غلو اور جمود تھا جو حدیث کے سامنے عقل کو حقیر سمجھتے تھے اور جو چیز بھی حدیث کے نام پر اُن کے سامنے پیش ہوتی وہ اسے بے تامل قبول کر لیتے۔ ان لوگوں کے جمود کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔

علامہ سیوطی تاریخ الخلفاء میں لکھتے ہیں کہ:

”ایک دفعہ ہارون کے دربار میں کسی نے یہ حدیث پڑھی کہ آدم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام میں مناظرہ ہوا، ایک شخص بول اٹھا کہ آدم اور موسیٰ کے زمانوں میں نو صدیوں کا بعد ہے۔ پھر وہ اکٹھے کیوں کر ہوئے اور مناظرہ کیسے چھڑ گیا۔ ہارون جو محدثین کا ہم خیال تھا اس قدر برہم ہوا کہ اس شخص کے قتل کا حکم صادر کر دیا۔“

فریقین کا تشدد

معتزلہ نے علم کلام کی بنیاد اہل تومدثین نے نہایت زور شور سے اس کی مخالفت کی۔ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، سفیان ثوری اور تمام اہل حدیث نے اس علم کا حصول حرام قرار دے

دیا۔ امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

”والی التحريم ذهب الشافعي وما لك و احمد

بن حنبل و جميع اهل الحديث من السلف.“ (احياء علوم

الاسلام)

امام شافعیؒ کہتے تھے کہ متکلمین کو درّے لگانا چاہئیں۔ امام احمد بن حنبلؒ کا قول تھا کہ متکلمین زندیق ہیں۔

معمولی معمولی اختلافات میں تشدد کا یہ عالم تھا کہ فریقین ایک دوسرے کو کافر ٹھہراتے تھے۔

اختلافی مسائل میں ایک یہ بھی تھا کہ ”قرآن قدیم ہے یا مخلوق و حادث؟“ معتزلہ کہتے تھے کہ خدا کی صفت تکلم قدیم ہے لیکن جو الفاظ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتے تھے وہ مخلوق و حادث تھے۔ محدثین کلام اللہ کو ہر حال میں قدیم تسلیم کرتے تھے۔ زیادہ غور و تفحص سے کام لیا جائے تو دونوں کا حاصل ایک ہی ٹھہرتا ہے لیکن فریقین نے اس مسئلہ کو کفر و اسلام کی حدِ فاصل قرار دے دیا، اور تشدد اس انتہا کو پہنچا کہ جعد بن درہم کو کوفہ کے والی خالد بن عبد اللہ القسری نے اس جرم کی پاداش میں گرفتار کر کے عید قربانی کے موقع پر حصولِ ثواب کی نیت سے ذبح کیا اور جب معتزلہ کو موقع ملا تو محدثین کو سخت سزائیں دی گئیں۔ حتیٰ کہ مامون کا زمانہ محدثین کے لیے ایک عبرت ناک دور ابتلا ثابت ہوا۔ مگر متوکل کے زمانہ میں محدثین نے بھی بڑھ چڑھ کر معتزلہ سے انتقام لیا۔

کیا معتزلہ کافر تھے؟

ایک عرصہ تک معتزلہ کو کافر سمجھا جاتا رہا لیکن جب فضا ذرا پُر سکون ہوئی اور معتزلہ کی علمی خدمات پر نظر ڈالی گئی تو محققین نے انہیں کافر کہنے سے انکار کر دیا۔

علامہ جلال الدین دوانی لکھتے ہیں:

”رہے معتزلہ تو صحیح یہی ہے کہ وہ کافر نہیں ہیں۔“ (شرح عقائد عضدی)

مشہور محدث علامہ تقی الدین سبکی لکھتے ہیں:

”یہ دونوں گروہ اشعریہ اور معتزلہ برابر کے جوڑ ہیں اور دونوں
 متکلمین کے سرگروہ ہیں اور اشعریہ زیادہ اعتدال پر ہیں۔“ (شرح احیاء
 الاسلام)

علامہ رازی فرماتے ہیں:

”میرے والد ماجد، شیخ القاسم انصاری کا یہ قول بیان کیا
 کرتے تھے کہ اہل سنت کا خیال خدا کی قدرت کی وسعت پر ہے اور
 معتزلہ کی نظر خدا کی تعظیم، اور مبرا عن العیوب ہونے پر ہے، اس لیے غور
 سے دیکھو تو دونوں خدا کی عظمت و تقدیس کے معترف ہیں۔ البتہ اس قدر
 ہے کہ کسی نے غلطی کی اور کوئی صائب الرائے ٹھہرا۔“ (تفسیر کبیر۔ سورۃ
 الانعام)

مشہور محدث امام نووی فرماتے ہیں:

”سلف و خلف کا اس پر برابر اتفاق رہا کہ معتزلہ وغیرہ کے

پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔“ (فتح المغیث، ص 143)

فقہی حیثیت سے معتزلہ اکثر حنفی المذہب ہوتے تھے۔ طبقات الحنفیہ میں جہاں اُن
 کے نام آتے ہیں تو اُن کا تذکرہ بھی اُسے عظمت و شان سے کیا جاتا ہے، جس طرح دوسرے
 علمائے حنفیہ کا۔ علامہ زنجیری مشہور معتزلی ہیں۔ ان کی تفسیر کشاف ادب، عربیت، معانی اور
 بلاغت کی بے مثال خوبیوں کے باعث آج تک نصاب میں داخل ہے۔ ان کے متعلق طبقات
 الحنفیہ میں لکھا ہے کہ ”من اکابر الحنفیۃ“، یعنی وہ اکابر حنفیہ میں سے تھے۔ فن بلاغت کے تمام
 ارکان یعنی جاحظ، سکاکی اور عبدالقادر جرجانی معتزلی تھے۔

معتزلہ نے اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق قرآن حکیم کی عقلی تفسیر پیش کی اور ثابت
 کر دیا کہ قرآن حکیم میں جو کچھ مذکور ہے علم و عقل کے مطابق ہے۔ معتزلہ مفسرین میں سے ابو مسلم
 اصفہانی، ابو بکر اصم، ابوالقاسم بلخی، علامہ زنجیری اور قتال کبیر بہت معروف ہیں۔

ابو مسلم اصفہانیؒ

ابو مسلم کا نام محمد بن بخر اصفہانی ہے۔ علامہ ذہبی نے محمد بن علی بن مہر یزدکھا ہے۔ کنیت ابو مسلم تھی۔ مؤرخ حمزہ کے بیان کے مطابق ان کی پیدائش 254ھ میں ہوئی، اور وفات 322ھ میں۔ صاحب طرز ادیب ہونے کے علاوہ بلند پایہ مفکر بھی تھے۔ ابن الندیم نے انہیں مشہور بلخا میں شمار کیا ہے۔ الفہرست کے الفاظ ہیں:

”کان کاتباً مرسلأً بلیغاً متکلماً جدلیاً“

وزیر ابوالحسن علی بن عیسیٰ بن داؤد بن جراح کو ان سے بڑی محبت تھی۔ ابوعلی زید اللتوخی لکھتے ہیں:

”محمد بن زید الداعی نے ذکر کیا کہ ابو مسلم معتزلی صرف مفسر قرآن ہی نہ تھے بلکہ اپنے زمانہ کے دوسرے علوم میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ وہ گوشہ نشین عالم ہی نہ تھے اعلیٰ درجہ کے منتظم بھی تھے۔ چنانچہ وہ اصفہان کے ناظم مقرر ہوئے اور اس کے بعد خلیفہ مقتدر نے انہیں فارس میں اپنا نائب مقرر کر دیا تھا۔ وہاں نیابت کا کام بخسن و خوبی انجام دیتے اور خلیفہ کو وہاں کے حالات سے باخبر رکھتے تھے۔“

انتظامی امور میں جب انہوں نے اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا تو ان کی شہرت ذور ذور تک پھیل گئی۔ چنانچہ 300ھ میں جب ابن ابی البغل کو صوبہ اصفہان کی مالیات اور اراضی کا انچارج بنایا گیا تو اُس نے ابو مسلم کو خط لکھ کر بلایا اور اصفہان میں اراضی کا ناظم مقرر کر دیا۔ جب ابن ابی البغل خود اصفہان آیا تو ان کے کام کو دیکھ کر اس قدر خوش ہوا کہ انہیں اپنی نیابت کے عہدہ پر مستقل کر دیا۔ جب 321ھ میں ابوعلی محمد بن رستم کی وفات ہوئی تو ابو مسلم کو اس کی جگہ مل گئی۔

شوال 321ھ کا ذکر ہے کہ علی بن بوہیہ پانچ سو سواروں کا دستہ لے کر فارس پر حملہ آور ہوا۔ مظفر بن یاقوت نے پانچ ہزار کی فوج سے اُس کا مقابلہ کیا مگر شکست کھا گیا۔ ابن بوہیہ ذی القعدہ کی چندرہ تاریخ کو اصفہان میں فاتحانہ داخل ہوا اور ابو مسلم کو معزول کر دیا۔

ابن ندیم نے کتاب الفہرست میں ابو مسلم کی مندرجہ ذیل کتب کا ذکر کیا ہے۔

1۔ جامع التاویل لمحكم التنزيل۔ یہ قرآن حکیم کی تفسیر تھی۔ بعض کہتے ہیں چودہ جلدوں میں تھی۔ صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق تیرہ جلدوں میں تھی۔ مؤرخ حمزہ نے لکھا ہے کہ اس تفسیر کا نام شرح التاویل تھا۔ افسوس ہے کہ آج علمی دنیا اس بلند پایہ تفسیر سے محروم ہے۔ آج اس کا وجود کہیں نہیں ملتا۔ اس تفسیر کی عظمت و مرتبت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ صاحب تفسیر کبیر علامہ فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں جہاں کہیں ابو مسلم کے اقوال نقل کرتے ہیں، کہیں اشارۃً ان اقوال کی تائید کرتے ہیں اور کہیں کھل کر ابو مسلم کی تعریف کرتے ہیں۔ قصہ سامری میں ابو مسلم کے تفسیری نکات نقل کر کے اُسے ترجیح دیتے ہیں اور پھر اس کی تائید میں اپنی طرف سے دلائل بھی بیان کرتے ہیں۔

حضرت زکریا علیہ السلام کے متعلق قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً کے تحت ابو مسلم کا قول نقل کرتے ہیں اور پھر فراطعیت سے جھوم جھوم کر لکھتے ہیں:

و هذا القول عندى حسن معقول و ابو مسلم
حسن الكلام فى التفسير كثير الخوض على الدقائق
واللطائف.

اور یہ قول میرے نزدیک احسن اور معقول ہے۔ اور ابو مسلم کا
کلام تفسیر میں نہایت معقول ہوتا ہے۔ وہ دقیق اور لطیف باتوں کو تہہ سے
ڈھونڈھ کر نکالتا ہے۔

بیشتر مسائل میں معتزلہ نے انفرادیت اختیار کی اور ان کے اقوال کو اذیت کا درجہ
حاصل ہے۔ چنانچہ ابو ہلال عسکری کتاب الاوائل میں بہت سی اولیات شمار کرتے ہیں تو اکثر
معتزلہ کا نام لیتے ہیں۔ مثلاً یہ جو آپ کے ہاں مسائل فقہیہ کے چار ماخذ قرآن، حدیث، اجماع،
قیاس تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہ سب سے پہلے مشہور معتزلی واصل بن عطاء نے بیان کیے تھے۔
”عام و خاص“ کی اصطلاح بھی اُسی کی وضع کردہ ہے۔ یہ مسئلہ کہ نسخ احکام میں ہو سکتا ہے نہ کہ
اقوال میں پہلے پہل اُسی نے بیان کیا۔

ابو مسلم بھی بیشتر مسائل میں منفرد ہیں اور ان کے اقوال کو اذیت کا درجہ حاصل ہے۔ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

”بہت سے مسائل میں ابو مسلم منفرد تھے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ناسخ منسوخ ہونے کے وہ قطعاً منکر تھے۔ امام رازی تمام ان آیتوں کی تفسیر میں جن کو لوگوں نے منسوخ مانا ہے، ابو مسلم کا قول اور ان کی توجیہ نقل کرتے ہیں اور ہر جگہ ان کے طرزِ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ ابو مسلم کی رائے سے متفق ہیں۔“

(علم الکلام ص 42)

ہمارے بیشتر مفسرین نے اکثر مقامات پر ابو مسلم کے اقوال سے ہی اپنے ذوق کو تسکین دی ہے۔ سر سید مرحوم اکثر جگہ ابو مسلم کا نام لے کر ان کے اقوال نقل کرتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے بھی اپنی تفسیر میں ابو مسلم کے اقوال لیے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ابو مسلم کی تفسیر اگر آج موجود ہوتی تو وہ علمی دنیا کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ قرار پاتی۔

2- جامع دسانلہ - یہ ابو مسلم کی دوسری کتاب ہے۔ اس کا ذکر مورخ حمزہ نے اپنی تاریخ میں کیا ہے۔

3- کتاب الناسخ والمنسوخ - یہ وہ کتاب تھی جس نے ابو مسلم کو زندہ جاوید بنا دیا۔ مفسرین میں پہلا مفسر ابو مسلم ہے جس نے قرآن میں ناسخ منسوخ تسلیم کرنے سے انکار کیا ہے۔ آج یہ مسئلہ بہت سے مفسرین نے تسلیم کر لیا ہے۔ مگر اُس زمانے میں اسے بہت اجنبی سمجھا گیا تھا۔ آج وہ کتاب موجود نہیں مگر علامہ رازی نے اپنی تفسیر میں ان آیات کے متعلق ابو مسلم کے اقوال نقل کیے ہیں جنہیں مفسرین منسوخ ٹھہراتے تھے۔ ہم نے زیر نظر کتاب میں ”ناسخ منسوخ“ کے عنوان سے ان اقوال کو یک جا کر دیا ہے۔

4- کتاب فی النحو -

ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی اس وقت دنیا میں موجود نہیں۔ اس لیے ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ کتابیں کس پایہ کی ہوں گی۔

غرض ابو مسلم ایک اعلیٰ درجہ کے منتظم، ایک بلند پایہ مفسر، ایک عظیم المرتبت ادیب، شاعر، اور فن نحو کے ماہر تھے۔ یہ تمام حیثیات بمشکل ہی کسی فردِ واحد میں جمع ہو سکتی ہیں۔ لیکن اس وقت اُن کا جس فضیلت سے تعلق ہے وہ تفسیر قرآن سے متعلق ہے جس کی مثالیں آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئیں گی۔ اس مقام پر اس فضیلت کو ایک بار پھر دہرا دینا ضروری ہے کہ ابو مسلم کی تفسیر سے مراد یہ ہے کہ اس میں قرآن کریم کے حقائق کو اس زمانے کی علمی سطح کے مطابق پیش کیا۔

حواشی

۱۔ جس طرح غیر (.....) دین۔

سورة البقرة

ایمان بالغیب

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ.

جو ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ (1:2)

متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے جس صفت کو اولیت کا درجہ عطا ہوا وہ یہی ہے کہ متقی ایمان بالغیب لاتے ہیں۔ عام مفسرین کا خیال ہے کہ ”غیب“ سے مراد وہ تمام اشیا ہیں جو حواسِ ظاہریہ و باطنیہ سے ماورائیں اور ہم کسی ذریعہ سے اُن کا ادراک نہیں کر سکتے۔ مثلاً خدائے قدوس کی ذات، ملائکہ، روز قیامت، کتب سماویہ اور پیغمبرانِ خدا کی رسالت، یہ وہ حقائق ہیں جن کا ادراک ہماری عقلی و فکری کاوشوں سے ماوراء ہے۔ ہماری کوئی کوشش بھی ان عظیم رازوں کی نقاب کشائی نہیں کر سکتی۔ اس لیے خدا اپنے انبیاء کے توسط سے نسل انسانی کی راہنمائی کے لیے ان حقیقتوں سے چلن سرکاتا ہے۔ گویا متقی وہ ہیں جو تذکرہ اشیا کی اطلاع پاکران کی تصدیق کرتے ہیں اور اپنے اخلاق و کردار کو ان کے مطابق ڈھالتے ہیں۔

ابو مسلم اصفہانی کو اس تفسیر پر کئی اعتراضات ہیں:

پہلا اعتراض

اس مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے خدائے قدوس نے ارشاد فرمایا:

وَالَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنْزِلَ مِنْ

قَبْلِكَ. وَبِالْآخِرَةِ هُمْ يُوقِنُونَ.

اور جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اُس پر جو آپ پر اتارا گیا ہے اور

اُس پر جو آپ سے قبل اتارا گیا اور قیامت پر یقین رکھتے ہیں۔

ان آیات میں بیان کیا گیا ہے کہ متقی نبوت، وحی اور آخرت کا اقرار کرتے ہیں۔ اگر

”الغیب“ کے لفظ میں بھی ان چیزوں کا مفہوم یہاں تھا تو پھر ان ہی چیزوں کا اعادہ محض ہے

ضرورت تھا۔ اس طرح تو معطوف اور معطوف علیہ ایک ہی چیز ہوئے اور یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

دوسرا اعتراض

مفسرین کے بیان کے مطابق اگر ”الغیب“ سے خدا کی ذات، پیغمبران خدا کی رسالت، ملائکہ، یوم قیامت اور کتب سماویہ ہی مراد ہوں تو انسان کو ان امور کا علم حاصل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کو غیب کا علم حاصل ہے۔ لیکن یہ عقیدہ نص صریح و عندہ مفتاح الغیب لا یعلمہا الا هو (اور غیب کی کنجیاں اُسی کے پاس ہیں۔ اُس کے سوا کوئی غیب نہیں جانتا) کے مخالف ہے۔ اس لیے صحیح قرار نہیں دیا جاسکتا۔

تیسرا اعتراض

جس چیز پر ”حاضر“ کے لفظ کا اطلاق ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ اُسے ”غیب“ نہیں کہا جاسکتا۔ پس اس صورت میں ہم لفظ ”غیب“ کا اطلاق اللہ اور اُس کی صفات پر نہیں کر سکتے۔ اس حاضر و موجود ہستی کو اگر غیب کہہ دیا جائے تو یہ کتنی مضحکہ خیز تعبیر ہوگی۔ اور اگر اللہ کو لفظ ”الغیب“ کے مفہوم میں شامل نہ سمجھا جائے تو ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت ہی باقی رہ جائیں گے۔ حالانکہ ایمان کا رکن اول ایمان باللہ ہے اور جب اس کو خارج کر دیا جائے تو ایمان کا مفہوم ہی فوت ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ جس طرح ہم پہلے کہہ چکے ہیں اگر ایمان بالرسالت اور ایمان بالآخرت کا ذکر مقصود ہو تو پھر عطف لگا کر ان ہی چیزوں کی تکرار بے معنی تھی۔

یہ ہیں وہ اعتراضات جن کی بنا پر ابو مسلم اصفہانی ایمان بالغیب کی تفسیر میں پرانی ڈگر سے ہٹ کر نیا راستہ نکالتے ہیں۔

الغیب، اصل میں مصدر ہے مگر اسم فاعل کا قائم مقام استعمال ہوا ہے جس طرح ”صوم“، ”صائم“ اور ”زور“، ”زائر“ کے معنوں میں استعمال ہوتے ہیں اسی طرح ”غیب“، ”غائب“ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اب آیت کا مطلب صاف ہے کہ مومن چاہے لوگوں کے سامنے ہوں یا اُن کی نگاہوں سے غائب وہ ہر حال میں اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اُن کی حالت منافقوں کی سی نہیں کہ:

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا إِلَىٰ شَيْطَانِهِمْ قَالُوا إِنَّا مَعَكُمْ إِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِؤُونَ. (2:14)

جب ایمان داروں سے ملے تو کہہ دیا کہ ہم بھی ایمان لائے اور جب تنہائی میں اپنے شیطانوں سے ملاقات ہوئی تو بول اُٹھے ہم تمہارے ساتھی ہیں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ہم ان سے مذاق کر رہے تھے۔

اور یوں بھی ”الغیب“ جب ”ب“ کے صلہ کے ساتھ (بالغیب بن کر) آئے تو حاضر نہ ہونے اور موجود نہ ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ سورہ یوسف میں ہے:

ذَٰلِكَ لِيَعْلَمَ أَنِّي لَمْ أَخُنْهُ بِالْغَيْبِ.

یہ اس لیے تا کہ وہ جان لے کہ میں نے اُس کی عدم موجودگی میں اُس کی خیانت نہیں کی۔

اس آیت میں ”بالغیب“ کا لفظ عدم موجودگی کے معانی دے رہا ہے۔ اس لیے آیہ زیر بحث میں بھی اس کا یہی مفہوم لینا ہوگا اور اس طرح آیت کی صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ مسلمانوں کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے وہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں، ہر حال میں ایمان دار ہوتے ہیں۔ اُن کی حالت منافقین کی سی نہیں کہ کفار سے ملے تو انہیں اپنی رفاقت کا یقین دلایا اور مسلمانوں سے ملاقات ہوئی تو اُن کی ہمدردی کا دم بھرنے لگے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ دونوں حالتوں میں جھوٹے ہیں، کفار کے ساتھی ہیں نہ مسلمانوں کے رفیق۔ وہ تو محض اپنے مفاد کے پرستار ہیں، جہاں سے فائدہ نظر آئے گا ادھر ہی جھک پڑیں گے۔ اس طرح اُن کی زبان اُن کے دل کی ترجمان نہیں۔

يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ.

اپنی زبانوں سے ایسی باتیں نکالتے ہیں جو اُن کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔

سورہ بقرہ کی ابتدائی آیات کے نفس مضمون سے بھی اس تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ ان آیات میں تین مختلف گروہوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ مومن، کافر اور منافق سب سے پہلے

مسلمانوں کی تعریف کی گئی اور ان کی صفات بیان کی گئیں۔ پھر اپنی ہٹ پر ڈٹ جانے والے کفار کا ذکر ہوا کہ حقائق و معارف کے دریا بہہ جائیں مگر ان کے قلوب واذہان پر ایسے قفل پڑے ہیں کہ دعوتِ حق و صداقت پر کان ہی نہیں دھرتے۔ پھر تیسرے گروہ کا ذکر چھڑا جسے قرآن منافقین کا گروہ قرار دیتا ہے۔ مومن اور کافر میں یہ چیز تو مشترک ہے کہ ان کی زبان اُن کے قلبی جذبات کا اظہار کرتی ہے۔ مومن اگر مومن ہے تو وہ ہر حال میں اپنی ایمان داری کا اعلان کرتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ کسی کی شکن آلود پیشانی یا دولت کی فراوانی کو دیکھ کر مرعوب ہو جائے اور ایسی باتیں منہ سے نکالے جن کا ادنیٰ سا تصور بھی اس کے دل میں موجود نہ ہو۔ اسی طرح کفار بھی اگر چہ انکار و تجدد کی روش پر قائم ہیں مگر اپنی حالت کسی وقت بھی نہیں چھپاتے۔ ان کا دل اگر حق و صداقت کو قبول نہیں کرتا تو اُن کی زبان بھی دین اسلام کے خلاف کھلتی ہے۔ مگر یہ تیسرا خطرناک گروہ ہے کہ اس کی کسی بات کا اعتبار نہیں، موسم اور ماحول کے اشارے پا کر رنگ بدلتے ہیں۔ مسلمانوں کے سامنے ہوں تو دین کی حمد و ثناء میں اُن کی زبانیں ڈوبی رہیں گی اور نظروں سے اوجھل ہوں گے تو اسی دین کا مذاق اڑائیں گے..... اسی طرح گویا ایمان بالغیب کے الفاظ مومنوں اور منافقوں کا فرق واضح کرنے کے لیے ہیں۔

يَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ کا مفہوم

وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ. (10:2)

اور وہ اُنہیں ڈھیل دے رہا ہے تو وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں

ہو رہے ہیں۔

جبر یہ اس آیت سے یہ استدلال کرتے ہیں کہ چونکہ اللہ تعالیٰ منافقین کو اُن کے طغیان میں ڈھیل دیتا ہے اس لیے وہ اور زیادہ بھٹکتے چلے جاتے ہیں۔ گویا خدا کا ارادہ یہی ہے کہ وہ راہِ راست پر نہ آئیں۔ لیکن ابو مسلم اسے اپنے مسلک (قدر) کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ طغیان کی اضافت چونکہ نافرمانوں کی طرف ہے، اس لیے ظاہر ہے کہ سرکشی پر اللہ نے انہیں مجبور نہیں کیا بلکہ یہ اُن کا اپنا فعل ہے۔ اگر خدا اُنہیں اس فعل پر مجبور کرتا تو اس کی اضافت خدا کی طرف ہوتی ہے۔ دوسری جگہ ”مد“ کے لفظ کی نسبت شیاطین سے کی گئی ہے۔

وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوهُمْ فِي الْغَيِّ.

اُن کے بھائی بندگمراہی میں اُن کی مدد کرتے ہیں۔

پہلی آ یہ میں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اللہ گمراہی میں اُن کی مدد کس طرح کرتا ہے؟ بظاہر یہ سوال بڑا موقع معلوم ہوتا ہے مگر غور کیجیے تو مطلب واضح ہے کہ چونکہ اللہ نے انہیں اپنے اعمال پر اختیار دیا ہے اس لیے جو لوگ گمراہی کی راہوں پر چل پڑتے ہیں، یوں نہیں ہوتا کہ انہیں اپنی بد اعمالیوں کی فوراً سزا مل جائے۔ اگر ایسا ہوتا تو یہ زندگی امتحان نہ ہوتی بلکہ نیکی اور ہدایت کی راہیں اختیار کرنے کے لیے مجبوری کا پھندا بن جاتی۔ مگر خدائے قدوس نے حیات انسانی کو آزمائش قرار دیا ہے (لَبِئْسَ لَكُمْ آيَاتُكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا) اور جو لوگ کفر اختیار کرتے ہیں انہیں ایمان لانے پر مجبور نہیں کرتا بلکہ انہیں پوری آزادی اور خود مختاری عطا کرتا ہے۔ وہ اس ڈھیل کے باعث اس زعم باطل میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ بھلے کام کر رہے ہیں۔ وہ کفر پر ڈٹے رہتے ہیں اور اُن کی قلبی و روحانی تار کی بڑھتی جاتی ہے۔ اسی طرح حق پرست اعمال حسنہ کی راہوں پر آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہی قوانین کو اپنی مدد شمار کرتا ہے اور اسی مدد کی نسبت اپنی ذات کی طرف کرتا ہے کیونکہ اس کے اسباب پیدا کرنے والا وہ خود ہے۔ کبھی بھی ابو مسلم سے متفق ہیں۔

یہ اشکال بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ دوسری آیت وَ إِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوهُمْ فِي الْغَيِّ میں کہا گیا ہے کہ اس ضلالت میں شیاطین اُن کی مدد کرتے ہیں۔ اور آ یہ زیر بحث میں کہا گیا کہ ان کی ضلالت میں خود خدا ان کی مدد کرتا ہے۔ چونکہ ایک ہی فعل کو شیاطین سے بھی منسوب کیا گیا اور پھر اُی کو اپنی ذات سے بھی نسبت دی گئی، اس لیے تعارض لازم آیا۔ لیکن سوچیے تو یہ کوئی ایسا بڑا اشکال نہیں کیونکہ گمراہ کرنے میں تو شیاطین اُن کی مدد کرتے ہیں اور اس گناہ کی فوراً سزا نہ دے کر اللہ انہیں ڈھیل دیتا ہے۔ اس لیے اس مدد کی نسبت دونوں کی طرف جائز ہے۔ جس طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ سورج فصل پکاتا ہے اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا فصل پکاتا ہے۔

تقدیس

وَنُقَدِّسُ لَكَ. (30:2)

اور ہم تیری تقدیس کرتے ہیں۔

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ ہم اپنے اعمال و افعال کو خطاؤں کی آلائش سے پاک رکھتے ہیں تاکہ وہ خالصتاً تیرے لیے ہوں اور ان میں شرک کا ادنیٰ شائبہ بھی نہ پایا جائے۔
ظلم

وَ اِذْ وَعَدْنَا مُوسٰى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ وَ
اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ. (51:2)

اور جب ہم نے موسیٰ سے وعدہ کیا چالیس راتوں کا پھر پکڑا تم نے گائے کا بچہ پیچھے اس کے اور تم ظالم تھے۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)
لغت میں ظلم نقص (کی کرنے) کو کہتے ہیں۔ کتاب اللہ میں ہے:
وَ كَلِمَاتُ الْجَنَّتَيْنِ اَنْتِ اَكْثَلُهَا وَلَمْ تَظْلِمِ مِنْهُ شَيْئًا.
آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب انہوں نے مارنے اور جلانے والے خالق کو چھوڑ کر پتھرے کو معبود بنالیا تو دین اور دنیا کی بھلائیوں میں ناقص ہو گئے۔

قریہ سے کون سی بستی مراد ہے؟

وَ اِذْ قُلْنَا اَدْخُلُوا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ. (58:2)

اور جب ہم نے انہیں کہا اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔

قریہ کا تعین کرنے میں مفسرین مختلف الرائے ہیں۔ ابن عباسؓ اور ابو زیدؓ کے نزدیک قریہ سے مراد وہ گاؤں ہے جس کا نام ریحاء تھا اور جو بیت المقدس کے قریب تھا۔ ابو مسلم اصفہانی، قتادہ اور ربیع کا خیال ہے کہ قریہ سے بیت المقدس ہی مراد ہے۔ کیونکہ دوسری جگہ اس حکم کو بیان کرتے ہوئے اللہ نے قریہ کی بجائے ارض مقدس کا لفظ خود ہی ارشاد فرمایا ہے:

اَدْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ.

(سورہ مائدہ)

ارض مقدس میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی

ہے۔

چونکہ دونوں آیتوں میں ایک ہی حکم بیان ہوا ہے، اس لیے قریہ سے بیت المقدس ہی مراد ہوگا۔

ابن عباسؓ اور ابو زید کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ اس حکم کے بعد کی آیت **فَبَدَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا** میں ”ف“ تعقیب کے لیے آئی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ قریہ میں داخل ہونے کے حکم کے معاً بعد حضرت موسیٰؑ کی زندگی ہی میں انہوں نے قول بدل دیا لیکن موسیٰؑ صحرائے تہ میں وفات پا گئے اور وہ بیت المقدس میں داخل نہ ہوئے اس لیے اس قریہ سے بیت المقدس قطعاً مراد نہیں ہو سکتا۔

ابو مسلم اس اشکال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ سورہ مائدہ میں بیت المقدس میں داخل ہونے کا جہاں حکم دیا گیا ہے وہاں صاف بتایا گیا ہے کہ بزدل بنی اسرائیل اُس بستی میں داخل نہ ہوئے اور اللہ نے چالیس سال تک وہ بستی اُن پر حرام کر دی اور وہ صحراؤں میں سرگرداں پھرتے رہے۔ سورہ بقرہ کی ان آیات میں بنی اسرائیل کی جو فرد جرم مرتب کی گئی ہے وہ کسی مخصوص زمانہ سے متعلق نہیں بلکہ مختلف زمانوں کے جرائم بیان کیے گئے۔ پس یہاں جو ”ف“ آئی ہے اس کا یہ مطلب ہے کہ یہی حکم حضرت یوشعؑ کی زبانی پھر دہرایا گیا اور تب ”تبدیل قول“ کا واقعہ پیش آیا۔

حِطَّةٌ کا صحیح مفہوم

وَاذْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَقُولُوا حِطَّةٌ نَغْفِرْ لَكُمْ

خَضِيعُكُمْ وَ سَنُرِيذُ الْمُحْسِنِينَ. (58:2)

اور داخل ہو دو روازے میں سجدے کرتے ہوئے اور کہو بخشش مانگتے ہیں ہم بخشش گے ہم واسطے تمہارے خطائیں تمہاری اور البتہ زیادہ دیں گے ہم نیکی کرنے والوں کو۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین)

عام مفسرین کا خیال ہے کہ بنی اسرائیل کو حطہ، حطہ کہنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جس کا مطلب ”ہم بخشش مانگتے ہیں“ لیا جاتا ہے۔ لیکن ابو مسلم کے نزدیک اس کا یہ مطلب ہے کہ انہیں حکم دیا گیا کہ عاجزی و انکساری سے شہر میں داخل ہو جاؤ، اور کہتے جاؤ ”اے اللہ ہم اس بستی پر چھا

جائیں اور تو ہمیں اس میں ٹھکانا عطا فرما، یعنی حطہ چھا جانے کے معنی میں آیا ہے۔ قاضی نے اس قول کی مخالفت کی ہے۔ اس کا یہ خیال ہے کہ اگر حطہ کا یہی مفہوم ہوتا تو پھر اس کے ساتھ نَغْفِرْ لَكُمْ خَطِيئَتَكُمْ کا کیا تعلق تھا۔ یہ الفاظ کہ ”تم حطہ کہو اور ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے“ اس مفہوم پر دلالت کرتے ہیں کہ حطہ سے بخشش مانگنا ہی مراد ہے۔

قاضی کے اس اعتراض کا ابو مسلم کی طرف سے علامہ رازی یہ جواب دیتے ہیں کہ بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا گیا کہ تم سجدہ کرتے ہوئے یعنی خدا کے احکام کی پابندی کرتے ہوئے عاجزی اور فروتنی سے شہر میں داخل ہو جاؤ اور کہتے جاؤ ”اے اللہ ہمیں اتنی قوت عطا کر کہ اس بستی پر چھا جائیں اور ہمیں اس میں ٹھکانا عطا فرما۔“ اس میں خطاؤں کی بخشش کا تعلق اس وجہ سے ہے کہ جب وہ پوری انکساری کے ساتھ فرمانِ الہی کی تعمیل کریں گے تو اللہ ان کی پچھلی خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔

قول کی تبدیلی

قَبَّلَ الَّذِينَ ظَلَمُوا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ فَأَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا رِجْزًا مِنَ السَّمَاءِ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ.
(58:2)

مگر ان زیادتی کرنے والوں نے جو انہیں بتایا گیا تھا اُسے بدل ڈالا سو ہم نے ان زیادتی کرنے والوں پر آسمان سے عذاب نازل کیا کیونکہ وہ نافرمانی کرتے تھے۔

اکثر مفسرین اس بات پر متفق ہیں کہ تبدیل قول سے مراد لفظی تبدیلی ہے اور بنی اسرائیل حطہ کے بجائے حنطہ (گندم) کہنے لگے تھے، اس لیے ان پر طاعون کا عذاب نازل ہوا۔

ابو مسلم کے نزدیک تبدیل قول سے مراد لفظی تبدیلی نہیں بلکہ نافرمانی اور عملی مخالفت ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلَى مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوهَا
ذَرُونَا نَتَّبِعْكُمْ يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلِمَ اللَّهِ.

جب تم فتوحات سے حاصل کیے ہوئے مال کی طرف جاؤ گے
تاکہ اُسے لوٹو، پیچھے رہے ہوئے لوگ کہیں گے ہمیں چھوڑ دو تاکہ ہم
تمہاری پیروی کریں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے کلام کو بدل دیں۔
ان کا کلام الہی کو تبدیل کرنا عملی لحاظ سے تھانہ یہ کہ وہ الفاظ میں کوئی تبدیلی کرتے
تھے۔ پس یہاں بھی یہی صورت ہے۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ انہوں نے اللہ کے احکام کی عملاً
خلاف ورزی کی اس لیے انہیں اس کی سزا بھگتنی پڑی۔ آیت کے آخر میں فسق کا لفظ استعمال
کر کے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ عملاً خدا کی نافرمانی کرتے تھے۔

استثقا

وَإِذِ اسْتَسْقَىٰ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ. (60:2)

اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا۔

عام مفسرین کا خیال ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے لیے پانی کی
درخواست صحرائے تہ میں کی تھی، کیونکہ جب اللہ نے اُن پر ابررحمت کا سایہ کیا اور اُن کی خوراک
کے لیے من و سلویٰ کا نزول ہوا، اور ایسا لباس عطا فرمایا کہ نہ وہ ہرانا ہوتا تھا اور نہ پھٹتا تھا، اُس
وقت انہیں پیاس کا خوف ہوا اور موسیٰ کی درخواست پر اللہ نے پتھر سے پانی نکال دیا۔

لیکن ابوسلم اصفہانی کے خیال میں یہ واقعہ صحرائے تہ میں نہیں ہوا۔ بلکہ یہ الگ قصہ
ہے، اور استثقا کے معنی عام عادت کے مطابق بارش مانگنے کے ہیں۔ اللہ نے اُن کی دعا قبول
کر کے بارش بھی برسائی اور پانی کا چشمہ بھی ظاہر کر دیا۔

مصر سے کیا مُراد ہے؟

اهْبِطُوا مِصْرًا. (61:2)

مصر میں داخل ہو جاؤ۔

عام طور پر مصر کے معنی شہر ہی کے لیے گئے ہیں اور مصراً کی تینوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ یہ نکرہ کے لیے آئی ہے جس کا مطلب ہے ”کسی شہر میں داخل ہو جاؤ“ لیکن ابومسلم اصفہانی کے نزدیک اس سے مشہور شہر مصر^۱ مراد ہے جس سے بنی اسرائیل نکلے تھے۔ انہوں نے اس کے لیے دودلائل بیان کیے ہیں۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر ہم مصر کو بغیر تینوں پڑھیں تو وہ معرفہ ہوگا اور دنیا میں مصر فرعون کے بغیر کوئی ایسا ملک نہیں جس کا نام مصر ہو۔ جب یہ لفظ علم اور صفت دونوں طرح پر آتا ہے تو زیادہ مناسب یہی ہے کہ اسے صفت کی بجائے علم پر محمول کیا جائے جس طرح ظالم اور حرث سے مذکورہ قیود کے ساتھ علم مراد لینا زیادہ صحیح ہے، اور اگر تینوں کے ساتھ پڑھا جائے تب بھی اسے علم قرار دیا جاسکتا ہے، اور کہا جاسکتا ہے کہ تینوں تکبیر کے لیے نہیں بلکہ وسط کے لیے آتی ہے، جیسے نوح اور لوط پر تینوں آتی ہے۔

رہا یہ سوال کہ اللہ نے جب بنی اسرائیل کو سرزمین مصر کا وارث قرار دیا تھا، اور جب وہ ان کے لیے موروثی حیثیت رکھتی تھی تو اس میں داخلہ ممنوع قرار نہیں دیا جاسکتا۔ ان کے لیے سرزمین مصر کا موروثی ہونا اللہ کے اس قول سے ثابت ہے۔

وَأَوْزَنَّا هَا بَنِي إِسْرَآئِيلَ

اور ہم نے بنی اسرائیل کو اس سرزمین کا وارث کر دیا۔

اور جب یہ ثابت ہو گیا کہ وہ سرزمین ان کے لیے موروثی تھی تو یہ لازم آتا ہے کہ ان کے لیے اس کا داخلہ ممنوع نہ ہو۔ کیونکہ وراثت ملکیت کا فائدہ دیتی ہے اور ملکیت سے مطلق تصرف حاصل ہوتا ہے۔

اس کا یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ بعض حالات میں کوئی آدمی گھر کا مالک بھی ہوتا ہے مگر گھر میں اس کا داخلہ ممنوع بھی ہو جاتا ہے۔ مثلاً وہ اعتکاف کے لیے مسجد میں بیٹھے تو اس کے گھر میں اس کا داخلہ ممنوع ہو جاتا ہے، حالانکہ وہ گھر اس وقت بھی اس کی ملکیت میں ہوتا ہے۔ جب یہ صورت جائز ہے تو اسے تسلیم کرنے میں کیا حرج ہے۔ کہ اللہ نے ان کو مصر کا وارث قرار دے کر مصر ان کی ملکیت میں بھی دے دیا، اور ان کو اس میں تصرف کی اجازت بھی عطا کر دی لیکن اللہ نے

پھر اس میں اُن کا داخلہ ممنوع بھی کر دیا۔

ذلت و مسکنت

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ. (61:2)

اور اُن پر مسلط کر دی گئی ذلت اور مسکنت (محتاجی)۔

ذلت کے معنی خواری و رسوائی ہیں:

الذلة و الذل و الصغار: ذلت خواری و رسوائی کو کہتے ہیں۔ (تفسیر قرطبی)

مسکنت کے معنی فقر و فاقہ اور محتاجی کے ہیں۔

المسكنة الفقر و الفاقة و التشديد المحنة. مسکنت فقر و فاقہ اور سخت محنت کو

کہتے ہیں۔ (تفسیر کبیر)

ابو مسلم کے نزدیک ذلت اور مسکنت کا عذاب اُس خاص قوم کے لیے تھا جسے بنی

اسرائیل کہا جاتا تھا، اور جس نے اُن سنگین جرائم کا ارتکاب کیا تھا جن کا ذکر پچھلی آیات میں آچکا

ہے۔ اس آیت کا یہ مفہوم نہیں کہ یہودی ہر زمانہ میں فقر و فاقہ کی مصیبت میں مبتلا رہیں گے۔

رفع طور

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورُ. (63:2)

اور جب ہم نے لیا عہد تمہارا اور اٹھایا تم پر پہاڑ۔ (شاہ رفیع الدین)

ابن عباس کی تفسیر کے مطابق وَ رَفَعْنَا کی واو عاطفہ ہے، اور مطلب یہ ہے کہ بنی

اسرائیل سے عہد لینا پہلے کا واقعہ ہے اور رفع طور بعد کا۔ یعنی پہلے عہد لیا گیا، پھر جب انہوں نے

اس عہد کو توڑ ڈالا اور اللہ کی اطاعت سے منہ موڑ لیا تو ان پر پہاڑ بلند کیا گیا۔ اس طرح کہ وہ سمجھتے

تھے ابھی ہم پر گر جائے گا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ عہد لیتے وقت اُن کے اوپر پہاڑ بلند کیا تاکہ وہ اس کے

گر جانے کے خوف سے تسلیم کر لیں۔ لیکن ابو مسلم واو کو حالیہ قرار دیتے ہیں جیسے کہا جاتا ہے۔

فعلت ذلك والزمان زمان تو آیت کا منسوب یہ، وا کہ ہم نے تم سے اس حال میں عہد و پیمان

لیا جب کوہ طور تم پر بلند تھا یعنی تم کوہ طور کے دامن میں کھڑے تھے۔

پتھر اور خشیت

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ
أَوْ أَشَدُّ قَسْوَةً وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ
مِنْهَا لَمَا يَشْقُقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ
خَشْيَةِ اللَّهِ. (74:2)

پھر تمہارے دل سخت ہو گئے اس کے بعد بھی چنانچہ وہ مثل پتھر
کے ہیں۔ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت اور بے شک پتھر تو کوئی ایسا ہوتا ہے
کہ اس سے دریا پھوٹ بہتے ہیں اور کوئی پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے
پانی نکلتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے خشیت الہی کے باعث گر جاتا ہے۔

عام مفسرین کے نزدیک یہ تمام صفات پتھروں کی ہیں کہ ان سے نہریں بہتی ہیں،
چشمے پھوٹتے ہیں اور کئی پتھر خشیت سے گر بھی جاتے ہیں۔ مگر ابو مسلم کا قول ان سب سے الگ
ہے، اُن کے خیال میں وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ میں منها کی ضمیر کا مرجع قلوب
ہیں کیونکہ خشیت اُس خاص جذبہ کا نام ہے جو دل سے متعلق ہو۔ پتھروں کا خشیت سے کوئی تعلق
نہیں۔ گویا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ ان کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ بلاشبہ بعض پتھر
ایسے ہیں کہ ان سے سوتے پھوٹ بہتے ہیں، اور بعض دل ایسے ہیں کہ اُن پر خشیت طاری ہوتی
ہے اور وہ فرمانِ خداوندی کے آگے جھک جاتے ہیں۔ مگر ایک اُن لوگوں کے دل ہیں کہ نہ انہیں
دل کہا جاسکتا ہے نہ پتھر۔

امانی کا مفہوم

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيُّ وَإِنْ هُمْ
إِلَّا يَظُنُّونَ. (78:2)

اور اُن میں سے کچھ اُمی ہیں جو کتاب میں سے کچھ نہیں

جانتے سوائے اپنی خواہشات کے اور وہ محض گمان میں پڑے رہتے ہیں۔
تمنّی، امنیہ اور امانی تلاوت کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ شاعر کہتا ہے:

تَمَنَّى كِتَابَ اللَّهِ أَوَّلَ لَيْلَةٍ وَآخِرَهَا لَأَقْبَىٰ حَمَامِ الْمَقَادِرِ
وہ رات کے ابتدائی حصہ میں کتاب اللہ پڑھتا رہا اور آخری
حصہ میں جاں بحق ہو گیا۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ آیہ زیر نظر میں بھی ”امانی“ انہیں معنوں میں (تلاوت کے معنوں میں) آیا ہے۔ ابن عباس اور قتادہ کے نزدیک امانی سے مراد قلاوت ہے اور ”امیون“ سے وہ لوگ مراد ہیں جو کتاب کے معانی نہ سمجھیں محض الفاظِ رِث لیں۔ کسائی، زجاج اور ابن بسائب نے کہا کہ وہ نہ کتاب کو عمرگی سے پڑھ سکتے ہیں نہ لکھ سکتے ہیں۔ ان کا علم وہیں تک محدود ہے جہاں تک ان کے علما نے انہیں بتایا۔ ابوروق اور ابوعبیدہ کا خیال ہے کہ امانی سے مراد وہ قلاوت ہے جو طہر قلب سے ادا کی جائے کتاب میں نہ پڑھی جائے۔ لیکن ابو مسلم کے نزدیک امانی کے معنی قلبی خواہشات لینا زیادہ صحیح ہے۔ کتاب اللہ میں ہے:

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا
أَوْ نَصَارَىٰ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ.

اور انہوں نے کہا کہ جنت میں کوئی داخل نہیں ہو سکتا سوائے
یہودیوں اور نصraniوں کے یہ ہیں اُن کی اُمیدیں۔
دوسری جگہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَيْسَ بِأَمَانِيكُمْ وَلَا أَمَانِي أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ يَعْمَلْ
سُوْءً يُجْزَ بِهِ.

تمہاری تمنّاؤں کے مطابق ہوگا نہ اہل کتاب کی تمنّاؤں کے
مطابق جو بھی بُرائی کرے گا جزا پالے گا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنْتُمْ

یہ ہیں اُن کی تمنائیں انہیں کہیے اگر وہ سچے ہیں تو دلیل
لائیں۔

اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اہل کتاب میں سے بیشتر محض اُن پڑھ ہیں۔
انہیں کتاب کا ذرا سا علم بھی حاصل نہیں، ہاں اپنی خواہشات سے خوب واقف ہیں اور احکامِ الہی پر
نہیں بلکہ اپنی نفسانی خواہشات پر عمل کرتے ہیں۔

اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ

کتاب کے علم میں وہ محض اُنکل پچوسے کام لیتے ہیں۔

یہود اور اسیروں کا فدیہ

ثُمَّ اَنْتُمْ هَؤُلَاءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيقًا
مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظْهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِسْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ وَاِنْ
يَاْتَوْكُمْ اُسْرٰى تَفْذَرُوْهُمْ وَهُوَ مُحْرَمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ (2:85)

پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کرتے ہو اور اپنے ہی ایک
گروہ کو اُن کے وطن سے نکال بھی دیتے ہو اور اُن کے مقابلہ میں گناہ اور
ظلم کے ساتھ اُن کے مخالفین کی مدد بھی کرتے ہو اور اگر وہ اسیر ہو کر تم تک
پہنچتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو حالانکہ اُن کا وطن سے نکالنا
ہی تم پر حرام تھا۔ تو کیا تم کتاب کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک حصہ کا
انکار کرتے ہو۔

جمہور مفسرین کا خیال ہے کہ اُس وقت مشرکین اوس اور خزرج دو متخاصم جھٹوں میں
بٹے ہوئے تھے۔ یہودیوں کے قبائل بنی نضیر اور بنی قریظہ یہ کہا کرتے کہ جب مشرکین کے دونوں
گروہوں میں لڑائی ٹھن جاتی تو یہودیوں کا ایک قبیلہ اوس کے ساتھ ہو جاتا دوسرا خزرج کے ساتھ

رہتا۔ جنگ ہوتی اور ایک گروہ کی طرف سے جو یہودی قیدی ہو کر آتے انہیں وہی لوگ فدیہ دے کر چھڑا لیتے جنہوں نے میدانِ جنگ میں اُن کے خلاف تلواریں بلند کی تھیں، اور اُس قبیلہ کے بیشتر افراد کو قتل کیا تھا۔ ان لوگوں نے الفتوٰ منون ببعض الکتاب الخ کو پھیلی آیات سے مربوط قرار دیا ہے۔ یعنی یہ قتل و اخراج تو ریت کی صریح خلاف ورزی تھی، اور فدیہ لے کر انہیں چھڑا لینا تو ریت پر عمل تھا۔ ابو مسلم کے نزدیک قُفِلُوْهُمْ کے معنی ہیں فدیہ لے کر رہا کرنا، انہوں نے یہ مفہوم بیان کیا کہ قتل و غارت اور لوگوں کو اُن کے شہروں سے نکالنے کے علاوہ اگر کوئی قیدی تمہارے ہاتھ آتا ہے تو تم مال لیے بغیر نہیں چھوڑتے چاہے فدیہ لے کر قید سے نکالنا (اخراجہم) تمہارے لیے حرام ہی کیوں نہ ہو، اور الفتوٰ منون ببعض الکتاب کا پھیلی آیات سے محض اتنا تعلق ہے کہ اس میں بھی ان کا ایک جرم بیان کیا گیا ہے، کہ حضور سرورِ کائنات کے متعلق تمہاری کتابوں میں جا بجا پیش گوئیاں موجود ہیں لیکن تم ان پر ایمان نہیں لاتے اور اس کے بغیر اپنی کتاب کے باقی حصوں کو تسلیم کرتے ہو۔

فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ کا صحیح مفہوم

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ طَبَلُ لَعْنَتِهِمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا

مَّا يُؤْمِنُونَ. (88:2)

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب محفوظ ہیں، نہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے اُن پر لعنت کر رکھی ہے اور وہ بہت تھوڑا ایمان رکھتے ہیں۔

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے مفسرین قلیل کو ایمان کی صفت قرار دیتے ہیں یعنی وہ بہت تھوڑے احکام پر ایمان رکھتے ہیں۔

ای لا یؤمنون الا بقلیل مما کلفوا به (کبیر،

بیضاوی، مدارک، ابوسعود)

یعنی جن احکام پر انہیں مکلف کیا گیا ہے ان میں سے بہت کم پر ایمان لاتے ہیں۔

لیکن ابو مسلم کے نزدیک قلیل، مومنوں کی صفت ہے یعنی ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کی آمد کا انتظار

وَكَانُوا مِنْ قَبْلِهِ يَسْتَفْتِحُونَ. (89:2)

اور اس کے قبل وہ خود ہی (حضور کے متعلق) مشرکین کو بتایا کرتے تھے۔

وہ مشرکین کو آپ کی صفات بتاتے رہتے اور ان سے آپ کی پیدائش سے متعلق دریافت کرتے رہتے۔ یہاں یستفتحون، یفتحون کا مرادف ہے، اور فتح کے معنی خبر دینے اور بیان کرنے کے ہیں تو استفتاح خبر حاصل کرنے اور پوچھنے کے معانی میں آئے گا۔ یہ ابو مسلم اصفہانی کا قول ہے۔ جہاں تک دوسرے مفسرین کا تعلق ہے تو اُن کا خیال ہے کہ یستفتحون اپنے عام اور مشہور معنی کے لحاظ سے طلب نصرت کا مفہوم رکھتا ہے و معنسی الاستفتاح الاستنصار (ابن جریر) یستصرون بمحمد والقرآن (ابن عباس)

طویل زندگی کی لالچ

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَوٰةٍ وَمِنَ الَّذِينَ

أَشْرَكُوا. (96:2)

اور آپ انہیں سب لوگوں سے بڑھ کر زندگی پر حریص پائیں

گئے حتیٰ کہ مشرکوں سے بھی بڑھ کر۔

ابو مسلم کے نزدیک اس آیت میں مضمون کے لحاظ سے تقدیم و تاخیر ہے۔ اس کی ترتیب یوں ہوگی وَلَتَجِدَنَّهُمْ وَ طَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَى حَيَوٰةٍ یعنی تو اُن کو اور مشرکین کے ایک گروہ کو طویل زندگی کے لیے بہت حریص پائے گا۔ ان میں سے ہر آدمی یہ چاہتا ہے کہ کاش وہ ہزار سال کی عمر پاتا۔

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے واضح ہے۔

وَاتَّبِعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيْطَانُ عَلَىٰ مُلْكٍ سَلِيمٍ ۖ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٌ وَلَكِنَّ الشَّيْطَانِ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۖ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمُونَ مِنْ أَحَدٍ حَتَّى يَقُولَا إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ فَيَتَعَلَّمُونَ مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ ۚ وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَيتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهِ أَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ. (2:02)

اور یہ لوگ اس علم کے پیچھے لگ گئے جو سلیمان کے عہد میں شیاطین پڑھتے تھے اور سلیمان نے کفر نہیں کیا، البتہ شیطان ہی کفر کرتے تھے۔ لوگوں کو سحر کی تعلیم دیتے تھے، اور وہ اس علم کے پیچھے بھی لگ گئے جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت ماروت پر اتارا گیا تھا، اور وہ دونوں کسی کو بھی نہ بتاتے تھے، جب تک یہ نہ کہہ دیتے کہ ہم تو ایک امتحان ہیں سو تم کہیں کفر نہ اختیار کر لینا۔ مگر لوگ دونوں سے وہ چیز سیکھتے تھے جس سے وہ عورت مرد کے درمیان جدائی ڈال لیں۔ حالانکہ وہ فی الواقع کسی کو بھی اس کے ذریعہ نقصان نہیں پہنچا سکتے جب تک اللہ کا ارادہ نہ ہو اور یہ وہ چیز سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے نفع نہیں پہنچا سکتی، اور یہ بھی خوب جانتے ہیں کہ جس نے اسے اختیار کیا آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں، اور وہ بہت ہی بُری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے، کاش وہ اتنا ہی جانتے۔

ان آیات میں ہاروت ماروت جو دو نام آئے ہیں، ان پر ہمارے بعض عجوبہ پرست

مفسرین نے ایک عجیب و غریب قصہ کی بنیاد رکھی ہے۔ چنانچہ تفسیر عزیزی نے ابن جریر، ابن ابی حاتم، حاکم اور دیگر تفاسیر نے ابن عباسؓ، علی المرتضیٰؓ، مجاہد اور عبد اللہ بن عمرؓ سے روایت کی کہ حضرت اور لیس علیہ السلام کے زمانہ میں انسانوں کی بدکرداریاں اپنی انتہا کو پہنچ گئیں۔ فرشتوں نے خدا کے سامنے انسان کی بد اعمالیوں کی شکایت کی تو جواب ملا کہ انسان کو غصہ اور شہوت دو ایسی چیزیں دی گئی ہیں کہ اگر تمہیں مل جائیں تو تم بھی گناہوں میں ڈوب جاؤ۔ فرشتوں کو اپنے تقویٰ پر ناز تھا، انہوں نے کہا ایسی چیزوں کے باوجود ہم گناہوں سے پاک رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم اپنی جماعت میں سے دو نہایت متقی فرشتے چھانٹ لو انہیں ہم دونوں چیزیں دے دیتے ہیں، اور پھر دیکھ لیتے ہیں کہ وہ تقویٰ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ ہاروت اور ماروت دو تقویٰ شعار فرشتوں کا انتخاب ہوا۔ خدا نے انہیں غصہ اور شہوت دے کر بابل میں اتار دیا تاکہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف سے فیصلے کریں، اور روزانہ شام کو اسم اعظم پڑھ کر آسمان پر آ جایا کریں۔ یہ دونوں ایک مہینہ تک یوں ہی آتے جاتے رہے۔ زمین پر ان کے عدل و انصاف کا چرچا ہونے لگا۔ اتفاق سے ایک حسینہ نے اپنے خاوند کے خلاف مقدمہ دائر کیا۔ عام روایات میں ہے کہ اس کا نام زہرہ تھا۔ مگر حضرت علیؓ کی روایت میں ہے کہ اس کا نام برخت اور لقب زہرہ تھا۔ خیر کچھ بھی ہو فرشتے تو دیکھتے ہی عاشق زار ہو گئے اور اُس سے بُرے کام کی خواہش کی۔ اُس نے کہا میرے اور تمہارے دین میں بھی اختلاف ہے۔ دوسرے سیراشوہر بھی بڑا غیرت مند ہے اگر اُسے علم ہو گیا تو مجھے قتل کر دے گا۔ لہذا پہلے اُسی بُت کو سجدہ کرو جس کو میں اپنا معبود سمجھتی ہوں پھر میرے شوہر کو قتل کرو پھر میں تمہاری اور تم میرے۔ انہوں نے انکار کیا وہ چلی گئی مگر ان کے دل میں عشق کی آگ کچھ ایسی بھڑکی کہ زہرہ خوب سج دھج کر بیٹھی تھی۔ آج اُس نے اپنے وصال کی چار شرطیں پیش کیں:

1- یا تو وہ زہرہ کو اسم اعظم سکھا دیں۔

2- یا وہ بُت کو سجدہ کریں۔

3- یا وہ اُس کے شوہر کو قتل کرویں۔

4- یا وہ شراب پیئیں۔

ہاروت ماروت نے اس آخری جرم کو ہلکا سمجھا اور شراب پی لی۔ جب مست ہو گئے تو زہرہ نے اُن سے بُت کو سجدہ بھی کرا لیا، اپنا خاوند بھی قتل کرا لیا اور اسمِ اعظم بھی سیکھ لیا۔ وہ تو اسمِ اعظم پڑھ کر اور صورت بدل کر آسمان پر پہنچ گئی۔ اللہ نے اُس کی روح کو زہرہ ستارے سے متصل کیا اور اُس کی شکل زہرہ ستارے کی طرح ہو گئی۔ فرشتے اسمِ اعظم بھول چکے تھے وہ اپنے گناہوں پر پشیمان ہوئے، اور ادریس علیہ السلام کے پاس گئے، اور اپنی کہانی درودناک انداز میں بیان کی۔ ادریس نے اُن کے حق میں دعائے مغفرت کی، دوسرے فرشتوں نے اپنی غلطی کا اقرار کیا اور انسانوں کے حق میں دعا کرنے لگے۔ آخر بہت روز کے بعد حضرت ادریس کی دعا کا جواب آیا کہ ہاروت ماروت کو اختیار ہے کہ اس دنیا کی سزا قبول کر لیں یا آخرت کی۔ اُنہوں نے دنیا کی سزا قبول کر لی، اور دونوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کر بابل کے کنوئیں میں اُلٹا لٹکا دیا گیا۔ اس کنوئیں میں آگ بھڑک رہی ہے اور یہ لٹکے ہوئے ہیں۔

یہ قصہ سنن بیہقی اور مسند امام احمد میں بھی ہے۔ بلکہ یہ روایات بھی آتی ہیں کہ بعض لوگوں نے انہیں اس حال میں دیکھا بھی ہے اور اُن سے جادو سیکھا بھی ہے۔ چنانچہ حاکم نے اپنی مسند اور بیہقی نے اپنی سنن میں یہ روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا حضورؐ کے انتقال کے بعد ایک عورت میرے پاس آئی، جو انہیں پوچھتی تھی، میں نے انتقال کے متعلق بتایا اور پوچھا کہ اُسے سرور کائنات سے کیا کام ہے۔ اُس نے بتایا کہ میں اپنے شوہر کی تختیوں سے ننگ آ گئی تھی۔ میں نے ایک عورت سے اپنی اس مصیبت کا ذکر کیا۔ اُس نے مجھے ایک کتے پر سوار کرایا اور آں کی آن میں بابل پہنچا دیا۔ کنوئیں میں ہاروت اور ماروت کو لٹکے ہوئے دیکھا اور اُن سے جادو سیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے اُنہوں نے سمجھایا کہ جادو کفر ہے، مگر میں نے نہ مانا اور سیکھنے پر مصر رہی۔ آخر اُنہوں نے ایک تنور میں پیشاب کرنے کا مجھے حکم دیا میں نے ایسا کیا تو کیا دیکھتی ہوں کہ ایک نورانی سوار میرے جسم سے نکل کر آسمان کو اڑ گیا ہے، میں نے اس کے متعلق اُن سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایمان تھا جو مجھ سے الگ ہو گیا۔ اب میں جادو میں ماہر ہو گئی۔ چنانچہ گندم کا دانہ زمین میں ڈال کر حکم کرتی ہوں تو فوراً آگ آتا ہے پھر وہ بڑا ہو جاتا ہے، اُسے خوشہ لگتا ہے، آپ ہی آپ خوشے سے دانے نکل آتے ہیں، خود بخود پلے جاتے ہیں اور پھر پکی ہوئی روٹی میرے

سامنے آ جاتی ہے۔ اتنی طاقت کے باوجود میں ایمان چھن جانے پر سخت شرمندہ ہوں اور چاہتی ہوں کہ ایمان مجھے واپس مل جائے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے اُسے صحابہؓ سے ملنے کا مشورہ دیا کسی نے بھی اسے اُمید نہ دلائی۔ صرف ابن عباسؓ نے کہا کہ اگر تیرے ماں باپ ہیں تو اُن کی خدمت کر۔ اسی طرح کا ایک قصہ ابن منذر نے بھی اوزاعی سے نقل کیا ہے۔ اس قصہ کی لغویت پر کلام کرنے کی ضرورت نہیں۔ علامہ بیضاوی نے صاف لکھ دیا ہے کہ:

وما روى انهما مثلاً بشرين و ركب فيهما الشهوة

فحكى عن اليهود. (بيضاوی ص 70)

یہ جو روایت ہے کہ ہاروت و ماروت فرشتے سے آدمی بنائے گئے اور اُن میں شہوت رکھی گئی تو یہ یہودیوں سے مروی ہے۔ صاحب تفسیر مظہری فرماتے ہیں۔

وهذه القصة من اخبار الاحاد بل من الروايات

الضعيفة الشاذة وان هذه الاخبار لم يرو منها شيء

صحيح ولا سقيم عن النبي صلى الله عليه وسلم.

یہ قصہ اخبار احاد بلکہ ضعیف و شاذ روایات سے منقول ہے اس

قسم کی نہ کوئی صحیح حدیث نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے نہ غلط۔

آیت کے پہلے جزو و اتباعوا ما تتلوا الشیطان علی ملک سلیمان کا ترجمہ

عام طور پر یوں کیا جاتا ہے ”اور اس کے پیرو ہوئے جو کچھ کہ سلیمان علیہ السلام کے عہد سلطنت میں شیطان پڑھا کرتے تھے۔“ لیکن ابو مسلم کو اس ترجمہ سے اختلاف ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ تتلوا علی ملک سلیمان کے معنی ہیں کہ شیاطین عہد سلیمان کے متعلق، جو جھوٹ بولتے تھے، یہ لوگ اُسی کے پیرو ہو گئے کیونکہ ”تلی علیہ“ جھوٹ یا بہتان باندھنے کے معنوں میں آتا ہے، ”تلا عنه“ سچ کے لیے کہا جاتا ہے، اور اگر بالفرض دونوں جائز ہوں تب بھی بہتر یہ ہے کہ

یہاں بہتان یا افترا کے معنی لیے جائیں۔ کیونکہ تلاوت حقیقت میں خبر کے معنی دیتی ہے۔
 ’’نُلا فلان‘‘ اور ’’نُلا علی فلان‘‘ میں فرق یہی ہے کہ ’’نُلا علی فلان‘‘ صاف افترا کے
 معنوں میں آتا ہے۔ صدق اور کذب میں امتیاز کے لیے علی کا لفظ ہی کافی ہے۔ کیونکہ ’’روی
 صلی فلان‘‘ نہیں کہا جاتا، بلکہ ’’روی عن فلان‘‘ اور ’’اُخبر عن فلان‘‘ کہا جاتا ہے، اور
 ’’نُلا عن فلان‘‘ تو یہ خبر اور تلاوت دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ بھی ناجائز نہیں کہ وہ
 جو کچھ کہ تلاوت کیا جاتا تھا اور پڑھا جاتا تھا پس اس میں کُل اوصاف جمع ہیں۔

اور یہ خبر عطف ہے ’’علی ملک سلیمین‘‘ پر اور اس کی تقدیریوں ہے۔ ’’ما قتلو
 الشیطان افتراء علی ملک سلیمین و علی ما انزل علی المکین‘‘ (یعنی شیاطین جو
 کچھ پڑھتے تھے وہ سلیمان علیہ السلام کے متعلق اور اُس چیز کے متعلق افترا ہے جو دو فرشتوں پر
 نازل کی گئی تھی)۔

ابو مسلم نے اس بات سے سختی کے ساتھ انکار کیا ہے کہ سحر فرشتوں پر اتارا گیا تھا۔ اُن
 کے دلائل یہ ہیں:

پہلی دلیل

خداوند قدوس کا ارشاد وَلَکِن الشَّیْطٰنُ کَفَرُوْا یَعْلَمُوْنَ النَّاسَ السَّحَرَ
 (بلکہ وہ شیاطین تھے جنہوں نے کفر کیا اور لوگوں کو جادو سکھایا) اس چیز پر دلالت کرتا ہے کہ سحر
 کی تعلیم دینا کفر ہے اور اگر یہ چیز ملائکہ میں ثابت کی جائے تو لازم آئے گا کہ انہوں نے کفر کیا،
 اور یہ باطل ہے۔

دوسری دلیل

اگر سحر فرشتوں پر نازل کیا گیا تو یقیناً اسے منزل من اللہ ماننا پڑے گا، اور یہ بالکل
 ناجائز ہے، کیونکہ جادو کفر اور عبث ہے، اور ایسی چیز کا نزول خدائے قدوس کی ذات مقدس کے
 شایان شان نہیں۔ وما قدرُوا اللہ حق قدرہ (اور ان لوگوں نے اللہ کی حقیقی قدر نہیں
 پہچانی)۔

یہ جائز نہیں کہ انبیاء و جادو سکھانے کے لیے مبعوث ہوں۔ تو یہ بات بطریق اولیٰ ناجائز ہے کہ ملائکہ اس کام پر مامور ہوں۔

چوتھی دلیل

جادو کی نسبت کفار، فساق اور مرد و شیاطین کی طرف کی جاتی ہے، پھر یہ کیسے جائز ہے کہ ہم اسی چیز کو اللہ کی طرف منسوب کریں۔ جس سے وہ اپنے بزرگوں کو روکتا ہے اور نہ رکھنے والوں کو سخت سزا سے ڈراتا ہے۔ کیونکہ جادو جھوٹ کے سوا کچھ نہیں اور اللہ کا قانون اس کی بطلالت واضح کرنے کے لیے ہمیشہ متحرک رہا ہے۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں فرمایا۔

مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ.

اللہ اس جادو کو جلد ہی باطل کر دے گا جو تم لے کر آئے ہو۔

ان دلائل کے بعد ابو مسلم اس آیت کی تفسیر میں دوسرے تمام مفسرین کے خلاف ایک نئی راہ نکال لیتے ہیں، فرماتے ہیں۔

جس طرح شیاطین نے سحر کی نسبت ملک سلیمان کی طرف کر دی حالانکہ سلیمان علیہ السلام کا اس سے قطعاً تعلق نہ تھا۔ اسی طرح انہوں نے جو چیز فرشتوں پر نازل ہوئی تھی اُسے بھی سحر سے منسوب کیا، حالانکہ فرشتوں پر تو شریعت، دین اور دعوت الی الخیر کا نزول ہوا تھا، اور وہ یہی چیز لوگوں کو سکھاتے تھے، اور اپنی بعثت کی غرض ظاہر کرنے کے لیے تاکید کرتے تھے کہ ہم تمہارے لیے آزمائش ہیں پس ہمارا انکار نہ کرو، اور ایک گروہ ایسا تھا جس نے اس پیغام کو قبول کیا اور دوسرے نے اس کی مخالفت کی، اور یہ گروہ ایمان اور کفران دو چیزوں میں سے ایسی چیزیں سیکھنا چاہتا تھا جن سے وہ مرد اور عورت کے درمیان تفرقہ ڈال سکیں۔ حالانکہ جادو کسی کو نقصان نہیں پہنچاتا، ہاں یہ الگ بات ہے کہ اللہ کی طرف سے کسی کے نفع یا صدر میں فیصلہ صادر ہو چکا ہو اور اتفاق سے جادو گر کا جادو بھی اس کے مطابق ہو جائے۔ یعنی اللہ کسی کو مارنے کا فیصلہ کر چکا ہو اور کوئی جادو گر بھی اُسے مارنے کے لیے جادو کر رہا ہو تو یہ اتفاقی امر ہو، کیونکہ اللہ کا فیصلہ بہر حال

ہو کر رہے گا اور جادوگر کا نام ہو جائے گا۔

ناسخ منسوخ کی بحث

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا (2:106)

ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو کوئی اُس سے بہتر یا مثل اُس کے لیے لے آتے ہیں۔

اس آیت سے مفسرین یہ استدلال کرتے ہیں کہ قرآن حکیم کی بعض آیات دوسرے احکام سے منسوخ ہو گئی ہیں۔ علما نسخ کی تین قسمیں قرار دیتے ہیں:

1- نسخ تلاوت

علما کا خیال ہے کہ بعض آیات قرآن حکیم میں باقی نہیں رہیں حالانکہ وہ قرآن کی آیات تھیں اور پھر طرفہ یہ کہ اُن کا حکم باقی ہے۔ اس کی دلیل میں کہا جاتا ہے کہ آیہ رجم پہلے قرآن میں موجود تھی پھر اُسے قرآن سے نکال دیا گیا اور نماز وغیرہ میں اُس کی تلاوت جائز نہیں تاہم اس کا حکم اب بھی باقی ہے۔ آیہ رجم یہ ہے:

الشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ إِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوهُمَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ.

شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت اگر زنا کر بیٹھیں تو دونوں کو سنگ سار کر دو یہ اللہ کی طرف سے سزا ہے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

تفسیر عزیزی میں اس قسم کی اور بھی بہت سی عبارتیں لکھی گئی ہیں جنہیں کتاب اللہ کی آیات قرار دیا گیا ہے۔

2- نسخ حکم

منسوخ فی الحکم وہ آیات قرار دی گئی ہیں جو مفسرین کے نزدیک قرآن میں موجود ہیں مگر ان کا حکم ساقط ہو گیا ہے۔ اس کی کئی مثالیں بیان کی جاتی ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ قرآن کی بعض آیات کا حکم بھی باقی نہیں اور وہ تلاوت سے بھی منسوخ ہوگئی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک آیت تھی عَشْرَ رَضَعَاتٍ مَّغْلُومَاتٍ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عورت کا دودھ دس گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی۔ مگر اب یہ آیت قرآن میں مودود ہے نہ اس کا حکم باقی ہے۔ اب ایک گھونٹ سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے..... قرآن میں نسخ کی دو صورتیں بیان کی جاتی ہیں:

پہلی صورت: آیت کا نسخ آیت سے

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی بعض آیات بعض سے منسوخ ہیں جیسے مَنَاعٍ إِلَى الْخَوَلِ کی آیت اَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا کی آیت سے۔

دوسری صورت: آیت کا نسخ حدیث سے

کہا جاتا ہے کہ قرآن کی آیت اِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَٰلِدَيْنِ حَدِيثٌ لَا وَصِيَّةَ لِلْوَٰرِثِ سے منسوخ ہے۔ اسی طرح اور آیات بھی احادیث سے منسوخ ہیں۔

جہور مفسرین نسخ کے قائل ہیں۔ لیکن ابومسلم اصفہانی ہی وہ پہلا مفسر ہے جس نے نسخ سے انکار کیا۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:

جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے تو ایک عام آدمی بادی تعمق سمجھ سکتا ہے کہ جس آیت کا حکم باقی رکھنا مقصود تھا، اُس کی تلاوت کو منسوخ کرنا کسی صورت جائز نہیں۔ آخر اس میں کیا حکمت ہے کہ حکم تو برقرار رہے لیکن کلام اللہ میں اس حکم کی عبارت موجود نہ ہو۔ اسی طرح تیسری قسم میں جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض آیات کا نہ حکم باقی ہے اور نہ ہی وہ قرآن میں موجود ہیں، یہ بھی کتاب اللہ کے شایان شان نہیں۔ جس کتاب کی حفاظت اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے رکھی ہو اُس میں کمی یا زیادتی کبھی نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح نسخ کی صورتوں میں سے دوسری صورت کا بھی اکثر فقہانے انکار کیا ہے، شافعی اس صورت کے خلاف خود حضور ہی کا قول پیش کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کلامی لا ینسخ کلام اللہ (میری بات اللہ کی بات کو منسوخ نہیں کر سکتی)۔

دوسرے فقہاء یہ دلیل دیتے ہیں کہ قرآن نص قطعی ہے اور حدیث نص ظنی، پس یہ کسی صورت میں جائز نہیں کہ نص قطعی کو نص ظنی سے منسوخ مانا جائے۔ رہی یہ چیز کہ قرآن کی بعض آیات بعض سے منسوخ ہیں، تو یہی وہ چیز ہے جسے تمام مفسرین تسلیم کرتے ہیں۔ مگر غور کیجئے تو یہ بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ یہ کہنا کہ قرآن کے بعض احکام بعض کے مخالف ہیں۔ اللہ کے اس دعوے کی تردید کرنا ہے کہ قرآن میں کوئی اختلاف نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کی دلیل بھی یہی دی ہے کہ اس کی آیات میں باہم تناقض و اختلاف نہیں لو کان من عند غیر اللہ لوجدوا فیہ اختلافاً کثیراً۔ اب جو لوگ بعض آیات کو دوسری آیت سے منسوخ مانتے ہیں، انہیں یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ایسی آیات باہم مختلف ہیں کیونکہ اگر اختلاف نہ ہو تو منسوخ قرار دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ قرآن حکیم نسخ کے مسئلہ کو غلط ٹھہراتا ہے بلکہ کوئی ضعیف سے ضعیف حدیث بھی ایسی نہیں جس میں خود حضورؐ نے فرمایا ہو کہ قرآن کی بعض آیات بعض سے منسوخ ہیں یا کسی ایک آیت کے متعلق ہی کہہ دیا ہو کہ یہ منسوخ ہے۔ صحابہ کے اقوال میں بعض آیات کے متعلق بے شک نسخ کا لفظ آیا ہے، مگر یہ عجیب بات ہے کہ جس آیت کو ایک صحابی منسوخ مانتے ہیں دوسرے اسی کو غیر منسوخ قرار دیتے ہیں۔ تو ہم اُس صحابی کے قول کو کیوں نہ تسلیم کریں جس سے قرآن میں اختلاف نہیں ماننا پڑتا۔ صحابہ کے اقوال میں لفظ نسخ کا استعمال وسیع معنوں میں ہوا ہے، یعنی جب کبھی کسی آیت سے کسی صحابی کو غلط فہمی پیدا ہوئی اور دوسری آیت نے اُس غلط فہمی کو دور کر دیا تو ایسے موقع پر بھی وہ نسخ کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مفسرین میں بھی اختلاف ہے بعض کسی ایک آیت کو منسوخ بھی تسلیم کرتے ہیں اور پھر اُسی کی غیر منسوخی کے اقوال بھی نقل کرتے ہیں اور اگر نسخ کے تمام اقوال کو تسلیم کر لیا جائے تو قرآن کا بہت بڑا حصہ (نعوذ باللہ) محض بے کار ہو جاتا ہے۔ امام سیوطی کا بیان ہے کہ پانچ سو آیات کو منسوخ کہا گیا ہے اور ان میں سے خود امام سیوطی نے اکیس آیتیں منسوخ مانی ہیں۔ لیکن اب مسلم صفہانی نے اُن اکیس کی بھی تفسیر کی اور ثابت کر دیا کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔

1- کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ

خَيْرًا الْوَصِيَّةَ لِلْأَقْرَبِينَ وَالْأَقْرَبِينَ. (2: 180)

جب تم میں سے کسی کو موت آنے لگے اور وہ مال چھوڑ رہا ہو تو

پر فرض ہے کہ وصیت کرو والدین اور اقربا کے لیے۔

اس آیت کو منسوخ کہا جاتا ہے مگر اس کے نسخ میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ آیت وراثت سے منسوخ ہے اور بعض کا خیال ہے کہ یہ آیت حدیث لا وصیة للوارث سے منسوخ ہے۔ حدیث سے تو صرف وہی لوگ استدلال کرتے ہیں جن کے نزدیک نص قطعی نص ظنی سے منسوخ ہو سکتی ہے۔ اس کے اجماع میں کلام ہے۔ رہا اس آیت کا آیت وراثت سے منسوخ ہونا تو ابو مسلم کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں میں کوئی تناقض نہیں۔ ان کے دلائل حسب ذیل ہیں:

(اولاً) اس آیت میں وصیت سے وہ عام معانی مراد نہیں جو مفسرین سمجھتے ہیں۔ بلکہ یہاں وصیت الہی سے اللہ کا حکم مراد ہے جس طرح دوسری جگہ ہے یوصیکم اللہ فی اولادکم (اللہ تمہاری اولاد کے بارے میں تمہیں وصیت کرتا ہے) پس زیر نظر آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اگر تم میں سے کوئی قریب الموت ہو تو اُس پر فرض ہے کہ اپنے والدین اور اقربا کے لیے اُن احکام پر عمل پیرا ہونے کی ہدایت کرے جو اللہ تعالیٰ نے آیہ وراثت میں ذکر کیے ہیں۔ تاکہ اُس کا مال خدا کے قانون وراثت کے مطابق تقسیم ہو اور کسی کے حصہ میں کمی نہ کی جائے۔

(ثانیاً) اگر یہ تاویل کی جائے تب بھی دونوں قسم کی آیتوں میں کوئی اتنا تناقض نہیں رہتا کہ میراث تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ورثا کے لیے عطیہ ہے اور وصیت خود مرنے والے کا عطیہ ہے۔ پس وارث کے لیے دو چیزیں جمع ہو گئیں، ایک قریب الموت آدمی کی وصیت اور دوسرے اللہ کا عطیہ۔

(ثالثاً) وراثت والی آیت میں بھی تو وصیت کو تسلیم کیا گیا ہے پھر وصیت والی آیت کو ہم منسوخ کیوں کر کہہ سکتے ہیں۔ آیہ وراثت میں ورثا کے حصص متعین کرنے کے بعد کتاب اللہ میں تصریح ہے کہ یہ حصے اُس مال سے دیے جائیں گے جو وصیت یا قرض ادا کرنے کے بعد باقی رہے گا من بعد وصیة یوصی بها او دین ۱ (11:4) آیت زیر نظر کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اگر قریب الموت آدمی اپنے والدین اور اقربا کے لیے مال کثیر چھوڑ رہا ہو تو اُسی پر فرض ہے کہ خیراتی کاموں کے لیے بھی وصیت کرے۔ سعد بن ابی وقاص کی متفق علیہ حدیث بھی اس مطلب

کی صحت پر ولایت کرتی ہے کہ جب وہ بیمار ہوئے تو اُن کی صرف ایک بیٹی تھی، وہ وصیت کرنا چاہتے تھے کہ سارا مال خیراتی کاموں پر صرف کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرما دیا اور صرف ایک تہائی مال کی وصیت کی اجازت دی۔ تاکہ ورثا بالکل محروم نہ رہیں۔ پس ظاہر ہے کہ آپؐ نے بھی یہاں وصیت سے خیراتی کاموں کے لیے وصیت مراد لی تھی۔ حضرت علیؑ اور حضرت عائشہؓ سے بھی ایسے ہی فیصلے مروی ہیں۔

(رابعاً) دونوں آیتوں میں تطبیق کی یہ صورت بھی ہو سکتی ہے کہ یہ وصیت اُن والدین اور اقربا کے لیے تسلیم کر لی جائے جو وراثت سے محروم ہوں۔ مثلاً ایک آدمی کے والدین کافر ہیں تو وراثت میں انہیں کوئی حصہ نہیں مل سکتا تو لازمی ہے کہ اُن کے لیے وصیت کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صلہ رحمی اور احسان کا حکم دیا ہے۔ و بالوالدین احساناً و ذی القربی۔

ابن جریر اور بیضاوی نے اس آیت کے غیر منسوخ ہونے پر اقوال نقل کیے ہیں۔ ان سے بھی ابو مسلم کی تائید ہوتی ہے۔

2- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ. أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۚ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ. (183:2)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، لکھا گیا ہے اُوپر تمہارے روزہ، جیسا کہ لکھا گیا تھا اُوپر اُن لوگوں کے جو پہلے تم سے تھے۔ تاکہ تم پر ہیز گاری کرو۔ روزہ دن گنتی کے، پس جو کوئی ہو تم میں سے بیمار یا اُوپر سفر کے، پس گنتی ہے اور دنوں سے اور اُوپر اُن لوگوں کے کہ طاقت رکھتے ہیں اس کی اور روزہ نہیں رکھتے، بدلا ہے کھانا ایک فقیر کا۔ پس جو کوئی کرے زیادہ نیکی پس وہ بہتر ہے واسطے اس کے اور یہ کے روزہ رکھو تم، بہتر ہے واسطے تمہارے اگر ہو تم جانتے۔ (ترجمہ شاہ رفیع الدین صاحب)

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِذْيَةَ طَعَامِ مُسْكِينٍ ط کا یہ مفہوم بیان کیا جاتا ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر روزہ نہ رکھیں تو وہ فدیہ دے دیں۔ روایات میں ہے کہ پہلے پہل لوگوں کو اجازت تھی کہ جو بھی روزہ نہ رکھے وہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت متصل بعد والی آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ الخ سے منسوخ ہے کیونکہ اس آیت میں بھی اس آیت کی باقی تمام ہدایات دہرائی گئی ہیں۔ لیکن وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ فِذْيَةَ طَعَامِ مُسْكِينٍ ط کا فقرہ ذکر نہیں کیا گیا پس پہلے یہ اجازت تھی کہ ”روزہ نہ رکھو تو فدیہ دے دو“ لیکن اب وہ رعایت ختم ہو گئی۔ ابو مسلم اس آیت کو بھی منسوخ تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک دونوں قسم کی آیات میں کوئی تناقض نہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں یہ عجیب بات ہوئی کہ ”جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں وہ فدیہ دے دیں“ تو گویا جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے وہی روزہ رکھیں۔ اصل میں اس کا مفہوم یہ ہو سکتا ہے کہ

”تم میں سے جو بیمار ہوں یا سفر پر ہوں پس وہ روزے قضا کریں۔ پھر صحت کے وقت یا سفر ختم ہونے کے وقت روزے بھی رکھیں اور ان میں سے جو مسکین کو طعام کھلانے کی طاقت رکھتے ہوں وہ فدیہ بھی دے دیں۔ یعنی دولت مندوں پر روزوں کی قضا کے ساتھ فدیہ بھی لازم کیا گیا۔“

اس طرح سوچے تو یہ آیت محکم اور غیر منسوخ ہے۔

اضافہ

اس آیت کے محکم ہونے پر ایک یہ دلیل بھی ہے کہ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ کے معنی لیے جائیں ”وہ لوگ جو بدشواری روزہ رکھ سکتے ہوں“ کیونکہ ”طاقت“ طوق سے ماخوذ ہے اور یہ اُس قدرت کو کہتے ہیں جسے انسان مشقت و دشواری سے کر سکے۔ اس کی تائید ائمہ تفسیر و لغت کے اقوال سے بھی ہوتی ہے۔ پطرس بستانی لکھتے ہیں:

”طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں لیکن یہ قدرت کی اُس مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بہ مشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ طوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے لا تحملنا ما لا طاقة لنا کے بھی یہ معنی نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو۔ بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ جس کا بجالانا ہمارے لیے بہت دشوار ہو۔“
(محیط المحيط، جلد دوم، ص 1304)

علامہ ابن منظور کہتے ہیں:

”طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لیے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔“ (لسان العرب، جلد 12، ص 103)
امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

”طاقت قدرت کی اُس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لیے بدشواری ممکن ہو۔“ (المفردات فی غریب القرآن)
”الطاقة اُس قوت کا نام ہے جس سے کوئی کام بدشواری کیا جاسکے۔ یعنی وہ کام انسان پر اتنا شاق گزرے جیسے کسی نے اُس کی گردن میں طوق ڈال دیا ہو۔“ (تاج العروس - اقرب الموارد)
علامہ زنجیری فرماتے ہیں:

”الطاقة کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلیف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور و علی الذین یطیقونہ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن پر روزہ شاق ہو پس اُن کے لیے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت محکم ہے، منسوخ نہیں۔“
(تفسیر کشاف، جلد اول، ص 255)

علامہ شبستری لکھتے ہیں:

”عربی زبان میں الوسع اُس قدرت کے لیے استعمال

ہوتا ہے جو سہولت کے ساتھ ہوا اور طاقت کا لفظ اُس قدرت کے لیے آتا ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہذا آیہ و علی الذین یطیقونہ کے معنی یہ ہوں گے کہ ”اور اُن لوگوں پر جو تکلیف اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے۔“

(روح المعانی، الجزا الثانی، ص 59)

مفتی محمد عبدہ فرماتے ہیں:

”الطاقة در اصل ممکنت و قدرت کے بالکل ادنیٰ درجے کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اطباق الشیء صرف اُس وقت کہتے ہیں جب اس کی قدرت نہایت ضعیف ہو جائے یعنی بدشواری اسے برداشت کیا جاسکے چنانچہ یطیقونہ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور اچانچ لوگ ہیں جن کے اعذار دُور ہو جانے کی کوئی توقع نہیں ہو سکتی۔“

(تفسیر المنار، جلد دوم، ص 155)

گویا اللہ تعالیٰ نے ایک اصول بیان فرما دیا کہ روزہ جن لوگوں پر سخت شاق گزرتا ہو، وہ فدیہ دے دیں۔ اس اصول کی جزئیات مرتب کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے۔ علامہ قرطبی لکھتے ہیں:

”تمام علما کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے سے معذور ہوں یا شدید مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکیں ان کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے۔ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ کہتے ہیں کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں تو میرے نزدیک پسندیدہ فعل ہے۔ حضرت انسؓ، ابن عباسؓ، ابو ہریرہؓ اور قیس بن السائبؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمے فدیہ ہے۔ امام شافعیؒ مع اصحاب الرائے (حنفیہ) امام احمدؒ اور امام اسحاقؒ کا قول بھی یہی ہے کہ انہیں فدیہ دینا چاہیے۔ نیز ابن عباسؓ کی

روایت ہے کہ انہوں نے اپنی اُم ولد سے فرمایا تھا جو حاملہ تھیں یا بچے کو دودھ پلا رہی تھیں کہ تو ان لوگوں میں سے ہے جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں لہذا تیرے ذمے فدیہ ہے قضا نہیں۔“

(جامع احکام القرآن، جلد دوم، صف 69-268)

مفتی محمد عبدہ نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے، فرماتے ہیں:

”الَّذِينَ يُطِيقُونَ“ سے یہاں بوڑھے اور اچانچ لوگ مراد ہیں جن کی معذوری دُور ہونے کی توقع نہیں۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی ان کے زمرے میں شمار ہوں گے جن کی معاش خدا نے پر مشقت کاموں میں رکھ دی ہو۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لیے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہے..... تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے روزہ رکھنا گراں ہو جس کے دُور ہو جانے کی کوئی اُمید نہ ہو۔ جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی اُمید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ افراد جو بیمار بھی نہیں مگر روزہ انتہائی دشواری سے رکھ سکیں۔ جیسے حاملہ اور دودھ پلانے والی، ان سب کے لیے جائز ہے کہ وہ روزہ کی بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔“

(تفسیر المنار، جلد دوم، صف 57-155)

علامہ قرطبی نے ابن عباسؓ کی جو روایت نقل کی ہے وہ واضح طور پر اس بات کی تائید کرتی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں اور وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَ کا یہ مفہوم ہے کہ جو لوگ سخت دشواری سے روزہ رکھ سکتے ہیں وہ فدیہ دے دیں۔

اس آیت کا اگلا حصہ بھی اس مفہوم کی تائید کرتا ہے، ارشاد ہے فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ (جو شخص برضا و رغبت قابل برداشت مشقت سے نیک کام کرے تو وہ اس کے لیے

بہتر ہے) اس میں يُطِيقُونَهُ اور تَطَوُّعَ کا فرق بالکل اُسی مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو بیان کیا گیا ہے۔ تَطَوُّعَ سے مراد ایسی اطاعت جو برضا و رغبت معمولی سی تکلیف سے کی جاسکے۔ ایک اور جگہ کمرہا کے مقابلہ میں طوعاً لایا گیا ہے۔

تائیلن نسخ کی یہ دلیل کوئی وقیع دلیل نہیں کہ ”دوسری آیت میں باقی تمام چیزیں دہرائی گئی ہیں۔ لیکن وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين ۛ نہیں دہرایا گیا اس لیے اسے منسوخ سمجھنا چاہیے۔“ کیونکہ یہ تو قرآن کا عام انداز ہے، کسی جگہ قرآن اللہ، ملائکہ، انبیاء، کتب اور یومِ آخرت پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے اور کہیں صرف اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان کا ذکر ہوتا ہے۔ اب جس طرح یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اللہ، ملائکہ، کتب، انبیاء اور یومِ آخرت پر ایمان والی آیت اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان والی آیت سے منسوخ ہے۔ اسی طرح زیر نظر آیت کا بھی اگر تکرار و اعادہ نہیں ہوا تو اسے منسوخ نہیں کہا جاسکتا۔ (مترجم)

3- اِهْلٌ لَّكُمْ لَيْلَةُ الصَّيَامِ الرَّفَثُ اِلَى نِسَائِكُمْ ۛ هُنَّ

لِبَاسٍ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ تَعْتَنُوْنَ اَنْفُسَكُمْ

فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْتَمِسْ بَاشِرُوْهُنَّ. (187:2)

تمہارے لیے روزے کی رات میں اپنی عورتوں کی طرف رغبت کرنا حلال کیا گیا ہے، وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کو نقصان پہنچاتے تھے پس اُس نے تمہاری طرف رجوع بہ رحمت کیا اور تم کو معاف کیا۔ پس اب بیویوں سے میل جول کرو۔“

نسخ کے قائل اس آیت کو بھی اپنی دلیل سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے رمضان کی راتوں میں خاوند بیوی کا ملاپ حرام کیا تھا۔ پھر اس آیت میں پہلے حکم کو منسوخ کیا گیا تھا اور مباشرت کو حلال ٹھہرایا گیا۔ روایات میں ہے کہ رمضان میں مسلمان رات کے وقت اپنی بیویوں کے پاس نہ جاتے تھے۔ اور حکم بھی یہی تھا۔ چند آدمی چورمی چھپے اس حکم کی خلاف ورزی کرتے تھے پس اللہ نے یہ آیت اتاری جس میں پچھلے حکم کو منسوخ کر دیا گیا اور جن لوگوں نے

خلاف ورزی کی تھی انہیں معاف کر دیا گیا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ حکم کہاں ہے جس کی ناسخ یہ آیت ہے، اس کا قائلین نسخ کے پاس کوئی جواب نہیں۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ رمضان کی راتوں میں عورتوں کے پاس جانے کی ممانعت اسلام میں نہیں بلکہ نصرانیت میں تھی۔ یہ آیت عیسوی شریعت کے حکم کو منسوخ کرتی ہے، ہماری شریعت کا کوئی حکم منسوخ نہیں۔ مفسرین اس قول کی تردید میں مندرجہ ذیل دلائل پیش کرتے ہیں:

- 1- پہلی دلیل یہ ہے کہ آیت **كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ** (تم پر روزے فرض کیے گئے جس طرح ان لوگوں پر فرض کیے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے) میں چونکہ ہمارے روزوں کو ان کے روزوں سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ حرمت چونکہ نصاریٰ کے روزوں میں ثابت تھی، اس لیے تشبیہ کا یہ فائدہ ہوا کہ گویا یہ ہماری شریعت کا ہی حکم تھا۔ اور یہ آیت اس حکم کو منسوخ کرتی ہے۔ اس لیے لازماً ہماری شریعت کا حکم منسوخ ہوا۔
- 2- دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر ہماری شریعت میں یہ چیز پہلے سے ہی حلال تھی تو پھر **أُحِلَّ لَكُمْ** (تمہارے لیے حلال کیا گیا) کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔
- 3- تیسری دلیل یہ ہے کہ آیت زیر بحث میں **عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ** (اللہ جانتا تھا کہ تم اپنی جانوں میں خیانت کرتے تھے) کے الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ اگر یہ چیز پہلے سے ہی ان کے لیے حلال ہوتی تو پھر انہیں خیانت کی کیا ضرورت تھی۔
- 4- چوتھی دلیل یہ ہے کہ اگر یہ چیز ان کے لیے حرام نہ ہوتی اور وہ اس سلسلہ میں معصیت کا اقدام نہ کر چکے ہوتے تو **فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ** (پس اللہ نے تم پر رجوع برحمت کیا اور تمہیں معاف کیا) کے الفاظ محض بے معنی ہیں۔
- 5- پانچویں دلیل یہ ہے کہ اگر یہ چیز پہلے بھی حلال ہوتی تو **فَالنَّسْنُ بِأَسْرُوْهُمْ** (پس اب ان سے میل جول کرو) کہنے کی کیا ضرورت تھی۔

چھٹی دلیل یہ ہے کہ اس آیت کے شان نزول کے سلسلہ میں جو روایات وارد ہوئی ہیں وہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ یہ حرمت ہماری شرع میں ثابت تھی۔
یہ ان لوگوں کے دلائل ہیں جو قرآن میں نسخ کے قائل ہیں۔ ابوسلم نے ان دلائل کی بھی تردید کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

”سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ روایات کے ساتھ ہم اس حد تک متفق ہیں کہ فرضیت صوم کے بعد مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ نصاریٰ کی طرح ہم پر بھی رات کو عورت کے پاس جانا ممنوع ہے لیکن یہ اُن کا اپنا خیال تھا، اللہ کا حکم نہیں تھا۔“

اب ان دلائل پر غور کیجیے جو اس سلسلہ میں پیش کیے گئے ہیں:

1- پہلی دلیل بالکل ضعیف ہے کیونکہ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ میں صوم کو صوم سے تشبیہ دینا مقصود ہے۔ یہ مقصد نہیں کہ صوم کی پوری شرائط اور جزئیات بھی دونوں مذاہب میں ایک جیسی ہوں گی۔
2- دوسری دلیل بھی کمزور ہے کیونکہ ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ یہ حرمت ہم سے پہلے کی شریعتوں میں ثابت ہے پس اَحِلَّ لَكُمْ کے یہ معنی ہوئے کہ وہ چیز جو دوسروں کے لیے حرام تھی، اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حلال کر دی۔

3- تیسری دلیل کا بھی یہی حال ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ خیال ضرور تھا کہ نصاریٰ کی طرح رات کو عورتوں کے پاس جانا ہمارے لیے بھی ممنوع ہے۔ اور وہ اسی لیے ان کے پاس نہ جاتے تھے۔ پس اللہ نے یہ حکم نازل کر کے ان کا شبہ دور کر دیا اور انہیں واضح طور پر بتا دیا کہ یہ حکم مسلمانوں کے لیے نہیں ہے۔ اتخون کے بنیادی معنی کسی چیز کو کم کرنے کے ہیں خَوْنُهُ اُس کو کم کر دیا۔ فسی ظہرہ خون اس کی کمزور ہے۔ نگاہ کی چندھیا ہٹ کے لیے بھی خَوْن کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ”خیانت“ نقص اور بے وفائی کے معنوں میں آتا ہے۔ خَانَ، اَخَانَ اور تَخَوْن، كَسَبَ، اِكْتَسَبَ اور تَكَسَّبَ کی طرح ایک ہی معنوں میں استعمال

ہوتے ہیں۔ خان الدلو الرشاء کے معنی ہیں رستی نے ڈول سے بے وفائی کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی۔ خانہ الدھر کے معنی ہیں زمانہ نے اُس سے بے وفائی کی یعنی اُس کی حالت میں نقص پیدا کر دیا۔ اس کی حالت بگاڑ دی۔ پس عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ نے جان لیا کہ تم نے اپنی جانوں سے بے وفائی کی اور ایک جائز چیز کو اپنے لیے ممنوع قرار دے کر اپنے نفس کے حقوق میں کمی کی۔ اب یہ واضح احکام اس لیے دیے جا رہے ہیں کہ اپنے نفس کے حقوق کی ادائیگی میں بے وفائی نہ کرو انہیں پوری طرح ادا کرو۔

4

چوتھی دلیل کی حیثیت بھی تاریکوت سے زیادہ نہیں فَتَابَ عَلَيْكُمْ کا صرف یہی مفہوم نہیں کہ کوئی توبہ کرے اور اللہ اُس کی توبہ قبول کر لے۔ توبہ اگر بندوں کی طرف سے ہو تو اس کا مطلب ہے ایک قسم کی عبادت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرنا اور اللہ رحمت اور احسان کے ذریعہ بندوں کی طرف رجوع کرتا ہے۔ عَفَا عَنْكُمْ میں عفو دراصل وسعت اور کشادگی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے تو فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَ عَفَا عَنْكُمْ کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان و انعام کیا اور وسعت و کشادگی عطا فرمائی کہ جو احکام پہلی شریعتوں میں سخت تھے وہ تمہارے لیے نرم کر دیے۔ ”عفو“ کا لفظ وسعت، کشادگی اور زیادتی کے معنوں میں عام استعمال ہوتا ہے۔ عفو المال اُس مال کو کہتے ہیں جو ضرورت سے زائد ہو۔ کتاب اللہ میں ہے يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ، قُلِ الْغَفْوُ (اے نبی لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں فرما دیجیے کہ جو کچھ ضرورت سے زائد ہو)۔ اَعْطَيْتُهُ غَفْوَ الْمَالِ کے معنی ہیں میں نے اُسے بغیر مانگے مال دیا۔ العفو من المَاءِ اُس پانی کو کہتے ہیں جو پینے والوں سے بچ جائے اور تکلیف و مزاحمت کے بغیر حاصل ہو سکے۔ عفا شعر البعير کے معنی ہیں اونٹ کے بال لمبے اور زیادہ ہو گئے۔ عفا عليه هي العلم کے معنی ہیں وہ علم میں اس سے آگے بڑھ گیا۔ اور اس نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔ غَفُوْ بہترین چیز کو بھی کہتے ہیں اور اُس چیز کو بھی جس کے حصول میں

وقت پیش نہ آئے۔

5- پانچویں دلیل کا بھی یہی حال ہے۔ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ لوگ مباشرت سے زکے ہوئے تھے۔ جب اللہ تعالیٰ نے احکام واضح فرما دیے اور شبہ کو زائل کر دیا تو ارشاد ہوا فَالْتَنَ بِأَشْرُوهُمْ (پس اب اپنی بیویوں سے میل جول کرو)۔

6- رہی چھٹی دلیل تو وہ اور بھی کمزور ہے۔ ہمارا قول ہے کہ یہ آیت پہلی شریعتوں کے حکم کو منسوخ کرتی ہے۔ اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں کہ صحابہ نے کس طرح عمل کیا۔ دوسرے خبر واحد اس معاملہ میں حجت نہیں ہو سکتی۔ پھر آیت زیر نظر کے الفاظ بھی تو ایسی روایات کے ضعف پر دلالت کرتے ہیں۔ روایات کہتی ہیں کہ ان لوگوں نے رسول خدا کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا لیکن قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے اپنی جانوں کی خیانت کی، یہ نہیں کہا گیا کہ انہوں نے اللہ کی خیانت کی، پس اگر وہ کوئی گناہ کرتے تو اللہ کی خیانت ہوتی۔

یہ تفسیر نقل کر کے علامہ رازی لکھتے ہیں ”فَتَابَ عَلَيْكُمْ“ کے معنی ابو مسلم کے نزدیک یہ ہیں کہ ”اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں اجازت کے ساتھ رجوع کیا اور تم کو وسعت دی۔“ جو مفسرین نسخ کے قائل ہیں ان کے نزدیک ضروری ہے کہ ”تُبْتُمْ“ کا لفظ مقدر مانا جائے یعنی آیت کی ترتیب یوں ہے کہ ”تُبْتُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ“ پس یہ جار نہیں کہ ہم کوئی خاص معافی پیدا کرنے کے لیے اپنی طرف سے الفاظ زائد کرتے رہیں۔ ابو مسلم نے ”عَفَا عَنْكُمْ“ کے معنی کیے ہیں ”اللہ نے تم کو وسعت دی۔“ عفو کا لفظ واقعی وسعت اور کمی کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے عَفْوٌ لَكُمْ عَنْ صَدَقَةِ الْخَيْلِ وَالرَّقِيقِ (میں نے تمہارے گھوڑوں اور غلاموں کے صدقہ میں کمی کر دی)۔ دوسری جگہ آپ نے فرمایا ”اُولٰٓئِیْهِ الْوَقْتُ رِضْوَانُ اللّٰهِ وَآخِرُهُ عَفْوُ اللّٰهِ“ یہاں بھی یہی تخفیف مراد ہے۔ ”اَتَانِي هَذَا الْمَالُ عَفْوًا“ کا مطلب ہے یہ مال مجھے آسانی سے ہاتھ آ گیا۔ پس ثابت ہوا کہ عفو کا لفظ بھی اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا کہ پہلے رمضان کی راتوں میں مباشرت حرام تھی۔ نیز اگر قائلین نسخ کا قول تسلیم کیا جائے تو عَفَا عَنْكُمْ میں بھی زیادتی کرنا پڑے گی، اور اس کی ترتیب ”عَفَا عَنْ“

ذُنُوبِكُمْ“ ہوگی۔ اس کے برعکس ابو مسلم کی تفسیر کو تسلیم کیا جائے تو کسی قسم کی مخفی ضمیروں کو نہیں ماننا پڑتا۔ نیز قَحْطَانُوْنَ اَنْفُسِكُمْ کے الفاظ بھی ابو مسلم کی تفسیر کی صحت پر دلالت کرتے ہیں کیونکہ اس خیانت کو اللہ نے اپنی طرف منسوب نہیں کیا بلکہ اُن کی جانوں کی خیانت کہا ہے اگر یہ گناہ ہوتا تو اللہ کی خیانت ہوتی۔

4- يَسْتَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ط قُلْ قِتَالٌ

فِيهِ كَبِيرٌ. (217:2)

اس آیت کو قَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً والی آیت سے منسوخ تسلیم کیا گیا ہے۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ دونوں آیات میں موضوع کا اس قدر بعد ہے کہ ان میں نسخ تسلیم کرنا عجیب مضحکہ خیز سی بات ہے۔ یہ حکم قِتَالٍ فِيهِ كَبِيرٌ زمانہ سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا حکم افراد سے متعلق ہے۔ دونوں احکام میں کسی قسم کا تناقض نہیں، دونوں کے موضوع الگ الگ ہیں۔ پہلی آیت میں ہے کہ ”اے نبی یہ لوگ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا کیسا ہے، کہہ دیجیے کہ اس میں جنگ کرنا بہت بُرا ہے۔“ اور دوسری آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ مشرکین سے جنگ کرو، یہ تو نہیں کہا گیا کہ اس مہینہ میں جنگ کرو۔ یہ تو ایک مطلق حکم ہے۔ نیز پہلی آیت میں بھی صرف یہی کہا گیا ہے کہ حرمت والے مہینہ میں جنگ کرنا برا ہے وہاں بھی یہ نہیں کہا گیا کہ اگر مشرکین کی دراز دستیاں حد سے بڑھ جائیں تب بھی تم آرام سے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، بلکہ اس کے برعکس متصل بعد والی آیت میں تصریح کی گئی ہے کہ وَصَدُّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ط (اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس کے ساتھ کفر کرنا اور مسجد حرام سے روکنا اور وہاں کے باشندوں کو وہاں سے نکال دینا اللہ کے نزدیک حرمت والے مہینہ میں جنگ کرنے سے بھی زیادہ برا ہے اور فتنہ قتل سے بڑھ کر برا ہے)۔ یعنی بے شک حرمت کے مہینے میں جنگ کرنا بری بات ہے لیکن فتنہ و فساد کی آگ بھڑکانا، اللہ کی راہ سے روکنا اور مکہ کے باشندوں کو ہجرت پر مجبور کرنا تو اس سے کہیں بڑھ کر بری باتیں ہیں۔ اندازِ بیاں سے واضح ہوتا ہے کہ حرمت والے مہینہ سے متعلق کفار نے استفسار کیا تھا۔ اس کا جواب دے کر اللہ نے فرمایا کہ تم کون ہوا ایسی باتیں پوچھنے والے، تم تو ایسے

بدترین جرائم کا ارتکاب کر چکے ہو جو قتل و غارت سے بڑھ کر ہولناک ہیں۔ چونکہ فتنہ کو قتل سے زیادہ ہولناک جرم کہا گیا ہے اس لیے حکم ہوا کہ قاتلوہم حتیٰ لا تکون فتنۃ ، قاتلوا المشرکین کافۃ۔ پس دراصل ان آیات میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کی وجہ سے ایک کو ناسخ اور دوسری کو منسوخ ٹھہرایا جائے۔

5- وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا مَلَ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ غَيْرِ إِخْرَاجٍ ؕ فَإِنِ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ ؕ (240:2)

تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں (اور) اپنی عورتوں کے لیے یہ وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک گھر سے نکالے بغیر انہیں خرچ دیا جائے، پھر اگر وہ خود چلی جائیں تو تم پر اس کا کوئی گناہ نہیں جو انہوں نے بھلائی سے اپنے حق میں کیا ہے۔

اس آیت کی ناسخ وہ آیت بیان کی جاتی ہے جس میں بیوہ کی عدت چار ماہ دس دن بتائی گئی ہے یعنی:

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ؕ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ؕ (234:2)

اور تم میں سے جو مر جائیں اور وہ عورتیں چھوڑ جائیں، وہ اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن انتظار میں رکھیں، پھر جب وہ اپنی میعاد کو پہنچ جائیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں جو وہ اپنے حق میں پسندیدہ طرق پر کریں۔

مفسرین کہتے ہیں کہ اول الذکر آ یہ (240:2) میں قریب الموت آدمی کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے حق میں وصیت کر جائے کہ وہ ایک سال تک بیٹھی انتظار کرتی رہے اور اسے

نان و نفقہ ملتا رہے۔ مؤخر الذکر آیت میں عدت کی مدت کو گھٹا کر چار ماہ و س دن کر دیا گیا ہے۔ پس اول الذکر آیت منسوخ ہوئی۔

بعض مفسرین کا خیال ہے کہ اول الذکر آیہ (240:2) آیت عدت (234:2) سے منسوخ نہیں کیونکہ اول الذکر آیت میں ایک سال کی قید محکم نہیں بلکہ اشارہ اس کا ذکر آیا ہے کیونکہ بیواؤں کی اس مدت کے اندر بھی دوسرا نکاح کرنے کی اجازت ہے فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِیْ مَا فَعَلْنَ فِیْ أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ط۔ ان لوگوں کے نزدیک آیہ (240:2) آیہ وراثت (12:4) سے منسوخ ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آیہ (240:2) میں خاوند پر فرض قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ایک سال کے نان و نفقہ کے لیے وصیت کر جائے۔ اس کے بعد اس کے ترکہ میں بیوہ کا کوئی حصہ نہیں لیکن آیت وراثت میں بیوہ کا باقاعدہ حصہ مقرر کیا گیا ہے اس لیے یہی آیت اس کی ناسخ ہے۔

ابو مسلم اصفہانی کہتے ہیں:

”بیوہ کے ساتھ اسلام سے پہلے کسی قانون نے انصاف نہیں کیا، زمانہ جاہلیت کے مشرکین میں ظلم کا یہ انوکھا طریقہ رائج تھا کہ مرنے والے اپنی بیویوں کے لیے ایک سال کے نان و نفقہ اور رہائش کی وصیت کر جاتے تھے۔ اب عورت پر لازم ہو جاتا کہ وہ ایک سال کی عدت پوری کرے۔ اس مرصہ کے دوران میں عورت کے لیے اور مرنے والے کے ورثہ کے لیے عورت کا کسی اور سے نکاح کرنا گناہ کبیرہ خیال کیا جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی قریب الموت اگر وصیت کر بھی جائے کہ ”اُس کی عورت ایک سال تک گھر رہے اور اُسے نان و نفقہ دیا جائے“ تب بھی عورت کے لیے یا ورثہ کے لیے یہ کوئی گناہ کی بات نہیں کہ وہ آپ کی وصیت کو توڑ کر معروف طریقہ سے نیا نکاح کر لے۔ پس جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے وصیت کرنے کا حکم دیا ہے انہیں آیت کے الفاظ پر غور کرنا چاہیے اَزْوَاجُہَا اور وَصِیَّۃٌ دُونِہَا

يَذَرُونَ کے مفعول ہیں پس اس کے یہی معنی ہوئے کہ ”تم میں سے جو مر جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں اور ان کے لیے وصیت کر جائیں کہ انہیں ایک سال تک گھر میں رکھا جائے اور نان و نفقہ دیا جائے تو وہ عورتیں اگر معروف طریقہ سے نکاح کر لیں تو تمہارے لیے کوئی گناہ نہیں۔“ اب چاہے آیت عدت (234:2) کو لیجیے چاہے آیت وراثت (12:4) کو دونوں آیات کا متذکرۃ الصدر آیت سے کوئی تعارض نہیں۔ قرآن وصیت کا حکم نہیں دیتا بلکہ اس وصیت کو بے معنی ٹھہراتا ہے۔“

ابو مسلم کی تفسیر نقل کر کے علامہ رازی اس کی معقولیت کی مندرجہ ذیل وجوہ بیان کرتے

ہیں:

- 1- قرآن میں نسخ تسلیم کرنا اصل کے خلاف ہے پس بقدر امکان ایسی صورت اختیار کرنی چاہیے کہ آیات کا باہمی تعارض رفع ہو۔ تعارض ثابت کرنے کی کوشش جائز نہیں۔
- 2- اصول فقہ میں یہ امر ثابت ہے کہ اگر تعارض اور تخصیص دونوں کا احتمال ہو تو تخصیص اولیٰ ہے۔ بخاری نے مجاہد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ آیات (240:2) منسوخ نہیں مخصوص ہیں یعنی یہ وصیت ایسی عورت کے لیے ہے جو حاملہ ہو۔ پس وہ وضع حمل تک انتظار کرے گی۔ پس نسخ تسلیم کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ مجاہد کا قول اختیار کر لیا جائے۔

تاہم ابو مسلم کا قول بہت ہی پاکیزہ ہے کیونکہ اگر وصیت کو حکم خداوندی تسلیم کیا جائے تو یہ ضرور ہے کہ آیت میں اپنی طرف سے کچھ الفاظ زائد کیے جائیں۔ اس صورت میں عبارت یوں ہوگی وَيَذَرُونَ اَزْوَاجًا فَلْيُؤْضُوا وَصِيَّةً (جو لوگ بیویاں چھوڑ جائیں پس وہ وصیت کریں) لیکن ابو مسلم کی بیان کردہ تفسیر میں ہمیں اپنی طرف سے کسی قسم کے اضافہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جب کلام اللہ میں مفہوم میں وضاحت کے لیے پوری عبارت صحیح ترتیب کے ساتھ آگئی ہے اور اُس سے آیات کا باہمی تعارض بھی لازم نہیں آتا تو پھر ہم خواہ مخواہ دو آیات کا تعارض ثابت کرنے کے لیے کیوں اپنی باتیں کتاب اللہ کے منہ میں ڈال کر اپنی خواہش کے مطابق مطالب حاصل

کریں۔ جمہور مفسرین نے جس طرح ضامن تسلیم کیے ہیں ان سے نسخ لازم آتا ہے لیکن ابو مسلم کی تفسیر کو ہر عقل سلیم تسلیم کرتی ہے۔ پس ہمارا فرض ہے کہ ایسی باتوں سے احتراز کریں جن میں بعض آیات کو بعض کا مخالف ٹھہرایا گیا ہے۔

6- وَ اِنْ تُبْذَرُواْ مَآ فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفَوْهُ یَحْٰسِبْکُمْ بِہِ اللّٰہُ. (284:2)

اور اگر تم ظاہر کرو جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے یا اُسے چھپاؤ اللہ اُس کا تم سے حساب لے گا۔

اس آیت کو لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ کسی نفس کو اُس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا) سے منسوخ مانا جاتا ہے۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ دونوں قسم کی آیات میں کوئی ادنیٰ سا اشارہ بھی ایسا نہیں جس کی بنا پر ان میں باہمی تناقض یا اختلاف تسلیم کیا جائے۔ لوگ کام کچھ کرتے ہیں اور اُن کے دلوں میں چھپی ہوئی خواہشات کچھ اور ہوتی ہیں۔ منافق مسلمانوں کے ساتھ نظام حق و صداقت کی کامیابی کی دُعائیں مانگتے مگر اُن کا دل اس نظام کے خلاف نفرت سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ ایک شخص محض دکھاوے کی خاطر ادائے صلوٰۃ کے لیے گھڑا ہو جاتا ہے، حالانکہ اُس کا دل کافر ہوتا ہے اور اُس میں خدا کا ادنیٰ سا تصور بھی موجود نہیں ہوتا۔ پس ایسی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور وہ اُن کا حساب لے گا۔ دوسری آیت کا مفہوم بالکل الگ ہے، اُس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے قدوس کسی آدمی کو اُس کی طاقت سے زیادہ فرائض کا مکلف نہیں کرتا۔

قالکین نسخ کہتے ہیں کہ ہر انسان کے دل میں وساوسِ شیطانی پیدا ہوتے رہتے ہیں اگر اللہ ان تمام کا حساب لے تو یہ یقیناً طاقت سے زیادہ تکلیف دینا ہے۔ کیونکہ وہ وسوسہ شیطانی دل میں نہ گزرنے دینا انسان کے بس سے باہر ہے۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ آیت کا انداز صاف بتا رہا ہے کہ یہاں وساوسِ شیطانی مراد نہیں بلکہ وہ عزائم مراد ہیں جو منافقوں کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں اور اگر ان میں وساوس ہی مراد لیے جائیں تب بھی اسی آیت کا اگلا لکڑا اس کی وضاحت کرتا ہے کہ فَيَغْفِرْ لِمَنْ يَّشَاءُ وَ يُعَذِّبْ مَنْ يَّشَاءُ ط یعنی اس حساب کے بعد اللہ کے قانونِ مشیت کے

مطابق جو قابل بخشش ہو اس کی مغفرت ہو جائے گی اور جو سزا کا مستحق ٹھہرا اُسے سزا ملے گی۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے وہ یہ نہیں کرے گا کہ کسی ایسی بات پر انسان کو عذاب میں مبتلا کرے جو اس کے بس سے باہر ہو۔ پس دونوں آیات میں کسی طرح بھی نسخ کا احتمال نہیں۔

7- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ. (102:3)

اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ

اُس کے تقویٰ کا حق ہے۔

اس آیت کو فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (اپنی استطاعت کے مطابق اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) یعنی جہاں تک ہو سکے اللہ کا تقویٰ اختیار کرو) سے منسوخ سمجھا جاتا ہے۔ نسخ کے قائل کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں تقویٰ کا حق ادا کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے اور دوسری آیت میں امکان بھر تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ تقویٰ کا حق ادا کر دینا بہت مشکل کام ہے اور اس کے مقابلہ میں امکان بھر تقویٰ اختیار کرنا سہل بات ہے۔ پس پہلی آیت دوسری آیت سے منسوخ ہوئی۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ مَا اسْتَطَعْتُمْ سے تقویٰ کی انتہائی بلندی مراد ہے یعنی جہاں تک ہو سکے تقویٰ اختیار کیا جائے اور یہی تقویٰ کا حق ادا کرنا ہے۔ مثلاً ایک شخص ایک ہزار روپے کا مقروض ہے وہ اپنے دوست سے اعانت کی درخواست کرتا ہے۔ دوستی کا حق ادا کرنا تو یہ ہے کہ وہ اس کا تمام قرض ادا کر دے، مگر دوست کی کُل کائنات ایک سو روپے کی رقم ہے۔ وہ یہ ساری رقم دوست کے قدموں میں ڈھیر کر دیتا ہے، تو کیا ہم یہ کہیں گے کہ اُس نے دوستی کا حق ادا نہیں کیا؟ نہیں! اُس نے دوستی کا حق ادا کر دیا، کیونکہ اپنی ساری کائنات دوست کے قدموں پر نچھاور کر دی۔ فرض کیجیے اسلامی لشکر کی اعانت کے لیے امیر المؤمنین مسلمانوں سے مال طلب کرتے ہیں۔ ایک شخص ایک لاکھ روپیہ دیتا ہے اور غریب جس کی کُل کائنات پانچ روپے کی حقیر رقم ہے وہ وہی لاکھ روپہ دیتا ہے تو یقیناً دونوں نے تقویٰ کا حق ادا کر دیا۔ پس دونوں آیات ایک دوسرے کی توضیح کرتی ہیں اور ان میں نسخ کا قطعاً احتمال نہیں۔

8- وَاِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ اُولُو الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى

وَالْمُسْكِينُ فَأَرْزُقُوهُمْ مِنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا (8:4)
 اور جب تقسیم کے وقت رشتہ دار اور یتیم اور مسکین موجود ہوں
 تو اُن کو ان میں سے کچھ دے دو اور اُن سے اچھی بات کہو۔

اس آیت کو منسوخ کہا جاتا ہے لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ آخر اس کو منسوخ کرنے والی
 آیت کون سی ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے اسے محکم کہا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اس آیت کا حکم باقی ہے، یہ الگ بات ہے کہ لوگ اس پر عمل پیرا
 ہونے میں سستی کرتے ہیں۔ رشتہ داروں سے وہی لوگ مراد ہیں جو دراشت سے محروم ہوں۔

9- وَالَّتِي يَأْتِيَنَّ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِسَائِكُمْ فَاسْتَشْهِدُوا
 عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنْكُمْ فَإِنْ شَهِدُوا فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّى
 يَتَوَفَّيَهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا وَالَّذِينَ يَأْتِيَهَا مِنْكُمْ
 فَادُّوهُمَا فَإِنْ تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُوا عَنْهُمَا (15-16:4)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو ”الفاحشہ“ کا ارتکاب کریں تو
 میں سے چار گواہ ان پر لاؤ پس اگر وہ گواہی دے دیں تو اُن کو گھروں میں
 بند رکھو، یہاں تک کہ انہیں موت لے جائے یا اللہ اُن کے لیے کوئی راہ
 نکال دے اور اگر دوسرا اس کا ارتکاب کریں تو ان کو سزا دو پھر اگر توبہ کریں
 اور اصلاح کر لیں تو اُن کو جانے دو۔

اس آیت کو سورہ نور کی اس آیت سے منسوخ سمجھا جاتا ہے جس میں زنا کی سزا کا ذکر
 ہے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہاں ”الفاحشہ“ سے مراد زنا ہے۔ اس کی سزا یہ مقرر کی گئی ہے کہ ایسی
 عورتوں کو گھر میں بند کر دینا چاہیے حتیٰ کہ یا وہ مرجائیں اور یا پھر اللہ ان کی سزا کے متعلق فیصلہ
 ردے..... بعد میں وہ فیصلہ سورہ نور میں ہو گیا۔ اس لیے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔

ابو مسلم کے نزدیک ”الفاحشہ“ سے ”سحاق“ مراد ہے یعنی عورتوں کی عورتوں کے
 ساتھ بد فعلی، اور اس کی سزا یہ ہے کہ انہیں گھروں میں بند رکھا جائے تاکہ وہ دوسری عورتوں سے نہ
 جس۔ یا تو اس حالت میں اُن پر موت آ جائے گی اور یا پھر اللہ اُن کے لیے کوئی راہ نکال دے یعنی

وہ توبہ کر لیں۔ جس طرح پہلی آیت وَالَّذِينَ عَمِلُوا سَيِّئَاتٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْهَا فَغُفِرَ لَهُمْ کے لیے مخصوص ہے اسی طرح وَالَّذِينَ عَمِلُوا سَيِّئَاتٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْهَا فَغُفِرَ لَهُمْ کے لیے مخصوص ہے کیونکہ وَالَّذِينَ عَمِلُوا سَيِّئَاتٍ ثُمَّ تَابُوا مِنْهَا فَغُفِرَ لَهُمْ کا صیغہ ہے۔ یہاں یہ اعتراض نہیں کیا جاسکتا کہ وَالَّذِينَ عَمِلُوا سَيِّئَاتٍ سے مرد اور عورت دونوں کا مراد ہونا جائز ہے۔ اور مذکر کا صیغہ تغلیب کے قاعدہ کے مطابق لایا گیا ہے۔ پھر جب دونوں کا احتمال ہے تو وَالَّذِينَ کو صرف دو مردوں سے کیوں مخصوص کیا گیا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر بالفرض ایسی صورت ہوتی تو پھر عورتوں کا الگ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ پس جب عورتوں اور مردوں کا علیحدہ ذکر کیا تو معترضین کا استدلال بے معنی ثابت ہوا۔

اگر مفسرین کے قول کو صحیح تسلیم کیا جائے اور یہاں ”الفاحشہ“ سے زنا مراد لیا جائے تو عورتوں اور مردوں کا الگ ذکر کرنا بے سود تھا۔ اس کے برخلاف ہم نے جو معانی نقل کیے ہیں ان کی تصدیق اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جب مرد مرد کے ساتھ بد فعلی کرے تو وہ زانی ہیں اور عورت عورت کے ساتھ بد فعلی کرے تو وہ بھی زنا کرنے والیاں ہیں۔ یعنی دونوں کو سزا ملے گی۔

أَوْ يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا کا مطلب مفسرین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعد میں اُن کے لیے یہی راہ نکالی جس کا ذکر سورہ نور میں ہے۔ اس کے برخلاف ہم یہ مطلب لیتے ہیں کہ وہ توبہ کریں اور اللہ تعالیٰ نکاح کی سبیل پیدا کر کے اُن کی شہوت کو جائز راہ پر ڈال دے گا۔ پس اگر زنا کی سزا کے لیے يَجْعَلَ اللَّهُ لَهُنَّ سَبِيلًا کے الفاظ آئے ہوتے تو لَهُنَّ کی بجائے عَلَيْهِنَّ ہوتا کیونکہ ”ل“ ضرر کے لیے نہیں آتا۔

پس یہ آیت منسوخ نہیں بلکہ اپنے حکم میں محکم ہے۔

10- وَالَّذِينَ عَقَدَتْ اٰیْمَانُكُمْ فَاَتَوْهُمْ نَصِيحَةً. (33:4)

جن لوگوں سے تمہارے عہد بندھے ہوئے ہیں انہیں ان کا

حصہ دو۔

الَّذِينَ عَقَدَتْ اٰیْمَانُكُمْ اصطلاح میں انہیں مولی الموالاة کہا جاتا ہے۔ عرب میں دستور تھا کہ دو شخص باہم قول و قرار کر کے ایک دوسرے کے دوست اور مددگار ہو جاتے،

یہ ترکہ میں سے حصہ پاتے تھے۔ مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں بھی ”مولی الموالات“ کا حصہ رکھا گیا ہے۔ لیکن اس حکم کو سورۃ احزاب کی اس آیت سے منسوخ کر دیا گیا وَأُولُوا الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ (اور رشتہ دار اللہ کے حکم میں مومنوں اور مہاجرین کی نسبت ایک دوسرے پر زیادہ حق رکھتے ہیں) لیکن نسخ کسی طرح ظاہر نہیں کیونکہ مولی اب بھی وراثت پاسکتا ہے اور فقہائے عراق نے اسی سے دلیل پکڑی ہے اور اس کا رتبہ رشتہ داروں سے بعد کا ہے۔ پس یہ دونوں آیات ایک دوسرے کی وضاحت کرتی ہیں، جس کا کوئی رشتہ دار ہو تو وہ دوسری آیت کی رُو سے اُس کا وارث ہے اور جس کا کوئی رشتہ دار نہ ہو، اُس کا مولی اُس کا وارث ہے۔

11- يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَحِلُّوْا شَعَاۤىِٕرَ اللّٰهِ وَلَا

الشَّهْرَ الْحَرَامَ. (3:5)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو اور نہ حرمت والے مہینے کی۔

اس میں وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ کا کلمہ منسوخ تسلیم کیا جاتا ہے۔ تاہم نسخ کی دلیل وہی ہے کہ قتال بعد میں مباح ہو گیا، آیہ (217:2) کے تحت اس پر بحث ہو چکی ہے۔

12- فَاِنْ جَاؤُوكَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ اَوْ اَعْرِضْ عَنْهُمْ. (42:5)

پس اگر وہ تیرے پاس آئیں تو اُن کے درمیان فیصلہ کر یا اُن سے منہ پھیر لے۔

یہود و نصاریٰ کے متعلق ہے کہ اگر وہ آپ کے پاس آئیں تو یا اُن کا انصاف کے ساتھ فیصلہ کیجیے اور یا اُن کا فیصلہ کرنے سے اعراض کر لیجیے۔ مفسرین اس آیت کو بھی منسوخ قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اس کی ناسخ وہ آیت ہے جس میں یہود و نصاریٰ کے درمیان فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ آپ چاہیں تو فیصلہ کرنے سے انکار کر دیں۔

فَاَحْكُم بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ.

سوان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے تیری طرف نازل کیا اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

ان دونوں آیات کو بھی کسی طرح منسوخ نہیں کہا جاسکتا۔ دوسری آیت کو غور سے دیکھا جائے تو وہ پہلی آیت کی تکمیل کرتی ہے۔ گویا حکم یوں ہے کہ ”جب وہ لوگ آپ کے پاس آئیں تو یا ان کا فیصلہ کیجیے یا فیصلہ کرنے سے انکار کر دیجیے، پس فیصلہ کرنا ہو تو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کیجیے۔“ اس مفہوم پر خود پہلی آیت کا آخری حصہ بھی دلالت کرتا ہے جہاں فرمایا وَ اِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِالْقِسْطِ (اگر آپ فیصلہ کریں تو انصاف سے فیصلہ کریں)۔ پس دونوں آیات میں نسخ کا احتمال نہیں۔ دوسری آیت (جسے ناسخ قرار دیا جاتا ہے) کو پہلی آیت کے اسی آخری نکتے کا قائم مقام سمجھنا چاہیے۔

13- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا شَهَادَةُ بَيْنَكُمْ إِذْ حَضَرَ أَحَدُكُمُ الْمَوْتُ حِينَ الْوَصِيَّةِ اثْنِ ذَوَا عَدْلٍ مِنْكُمْ أَوْ آخَرُونَ مِنْ غَيْرِكُمْ إِنْ كُنْتُمْ ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَأَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةُ الْمَوْتِ ؕ (106:5)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی تم میں سے جب کسی کو موت آجائے تو وصیت کے لیے اپنوں میں سے دو صاحبِ عدل لوگوں کی گواہی ہے یا کوئی اور دو تمہارے غیر میں سے اگر تم زمین میں سفر کر رہے ہو پھر تم کو موت کی مصیبت پہنچے۔

تاکلین نسخ کہتے ہیں کہ یہاں مرنے والا جو وصیت کرے اس کی گواہی کے سلسلہ میں دو مسلمان صاحبِ عدل گواہوں کی گواہی بھی قبول کی گئی ہے اور دو غیر مسلموں کی گواہی بھی قابلِ قبول قرار دی گئی ہے۔ پس یہ حکم آیہ وَ اَشْهَدُوا ذَوَى عَدْلٍ مِنْكُمْ سے منسوخ ہے کیونکہ وہاں صرف مسلمانوں کی گواہی قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

لیکن نسخ کا احتمال یہاں بھی باطل ہے کیونکہ دو غیر مسلم گواہوں کی گواہی اس وقت قبول کی گئی ہے جب وصیت کرنے والا سفر میں ہو۔ ایسی صورت میں اگر اس کے ساتھی مسلمان نہ ہوں

تو وسعت کی خاطر خدا نے غیر مسلم گواہوں کی گواہی کو بھی جائز قرار دیا ہے۔ تاکہ مرنے والے کی آخری خواہش پوری ہو کر رہے۔ دوسری آیت میں عام قاعدہ بیان کیا گیا ہے اور پہلی آیت خاص حالات کے ساتھ مشروط ہے۔ اس لیے دونوں میں نسخ کسی صورت جائز نہیں۔

14- اِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عَشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتِينَ وَاِنْ

يَكُنْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (65:8)

اگر تم میں سے بیس ڈٹ جانے والے ہوں تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں تو کافروں میں سے ایک ہزار پر غالب آئیں گے۔

مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت اگلی آیت سے منسوخ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تم اگر ایک سو ہوئے تو دو سو پر غالب آؤ گے۔

اَلنَّسْ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ؕ فَاِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ اَلْفٌ يَغْلِبُوا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔

اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا اور وہ جانتا ہے کہ تم میں کمزوری ہے۔ سو اگر تم میں سے ایک سو ڈٹ جانے والے ہیں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر تم میں سے ایک ہزار ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے دو ہزار پر غالب ہوں گے۔

دونوں آیات میں نسخ کا احتمال نہیں کیونکہ دوسری آیت میں وضاحت کر دی گئی ہے کہ اب مسلمانوں میں ضعف آچکا ہے اس لیے سو آدمی دو سو کے مقابلہ میں کافی ہیں۔ دونوں آیات اگرچہ خبر کے طور پر آئی ہیں لیکن ان سے حکم مراد ہے کیونکہ اَلنَّسْ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ کے الفاظ حکم کی دلالت کرتے ہیں پس پہلی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر تم میں ہی ثابت قدم رہنے والے ہو تو دو سو کے مقابلہ کے لیے تیار ہو جاؤ اور اگر تم سو ہو تو ایک ہزار کفار کے مقابلہ پر آمادہ ہو جاؤ۔ دوسری آیت میں چونکہ یہ علت واضح کی گئی کہ مسلمانوں میں ضعف آ گیا اس لیے وہاں سو آدمیوں

کو دوسو کا مقابلہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ پس دونوں آیات میں کوئی تعارض نہیں بلکہ مختلف وقتوں کے احکام ہیں کہ اگر قوت پہلے کی طرح ہو تو بیس دوسو کا مقابلہ کریں اور اگر مسلمانوں کی قوت کم ہو تو سو دوسو کا مقابلہ کریں، گویا پہلی آیت میں مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا گیا کہ وہ اپنے سے دس گنا فوج کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اور دوسری آیت میں رخصت دی گئی اور یہ مطالبہ کیا گیا کہ ضعف کی حالت میں بھی کم از کم دوسو کا مقابلہ تو کرنا چاہیے۔ پہلی آیت عزیمت پر دلالت کرتی ہے اور دوسری رخصت پر۔ پس کوئی نہیں کہہ سکتا کہ رخصت نے عزیمت کو منسوخ کر دیا، اور پھر اس وقت نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جب آیات قوت اور ضعف کے حالات کے ساتھ مشروط ہیں اور دوسری آیت ضعف کے لیے مخصوص ہے۔ جس طرح پانی نہ ہونے کی مجبوریوں میں اللہ نے تیمم کی رخصت دی اسی طرح قوت نہ ہونے کی حالت میں بھی اللہ نے رخصت دی ہے۔ پس جس طرح یہ نہیں کہا جاسکتا آیت تیمم نے آیت وضو کو منسوخ کر دیا ہے، اسی طرح یہاں بھی نسخ کا سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔

15- اِنْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ

فِي سَبِيلِ اللَّهِ. (41:9)

بلکے اور بوجھل نکل پڑو اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے

ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔

اس آیت کو آیات عذر سے منسوخ سمجھا جاتا ہے ”لَيْسَ عَلَى الْاَعْمٰی حَرْجٌ“، ”وَلَيْسَ عَلَى الضَّعَفَاءِ وَعَلَى الْمَوْضٰی“۔ ان دو آیات کے علاوہ بعض مفسرین اس آیت کو بھی ناسخ شمار کرتے ہیں ”وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنفِرُوا كَآفَّةً“ حالانکہ یہ آخری آیت تعلیم کے لیے نفر کے موضوع پر ہے۔ عذر والی آیات ناسخ نہیں بلکہ وہ پہلی آیت کی توضیح کرتی ہیں اور اس کا مفہوم واضح طور پر متعین کرتی ہیں۔ کیونکہ یہ محال ہے کہ اللہ تعالیٰ محتاجوں کو بھی بھاگنے کا حکم دے پس یہ اللہ کے اس دعویٰ کی تصدیق ہے ”قرآن کی تشریح ہمارے ذمہ ہے“ اِنَّ عَلَيْنَا بَيِّنَاتٍ اور ان آیات میں نسخ کا احتمال نہیں۔

16- اَلرَّانِیْ لَا یَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً وَالزَّانِیَةُ

لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ. (3:24)

زانی نہیں ”نکاح“ کرتا مگر زنا کرنے والی عورت یا مشرک عورت سے اور زنا کرنے والی عورت کے ساتھ کوئی نکاح نہیں کرتا سوائے زانی اور مشرک کے۔

اس آیت کو وَالنَّكَاحُ الْإِسْمَاءُ (اور نکاح کرو رانڈوں کو اپنے میں) سے منسوخ قرار دیا جاتا ہے۔ معلوم نہیں ان دونوں آیتوں میں کون سا اختلاف تھا کہ مفسرین نے یہاں بھی نسخ منسوخ کا سوال اٹھا دیا۔ ابو سلم پہلی آیت کے ایسے معانی بیان کرتے ہیں جن سے آیہ (3:24) نہ منسوخ کہی جاسکتی ہے اور نہ کوئی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”نَكَحَ“ کے معنی ملانے اور جمع کرنے کے ہیں۔ ”نَكَحَ النِّعَاسَ“ کے معنی ہیں ”نیند آنکھوں میں گھل گئی“، ”نَكَحَ الْمَطَرُ الْأَرْضَ“ کے معنی ہیں ”بارش زمین میں جذب ہو گئی“، یہاں لفظ نکاح استعارہ کے طور پر وطمی اور جماع کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ”زانی صرف زانیہ یا مشرک کے ساتھ ناجائز تعلق پیدا کرتا ہے اور زانیہ کے ساتھ کوئی بھی ناجائز تعلق پیدا نہیں کرتا سوائے زانی یا مشرک کے۔“

اس کے بعد اللہ نے ارشاد فرمایا وَحُرِّمَ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (اور یہ چیز یعنی ناجائز تعلق یا زنا مسلمانوں پر حرام کیا گیا ہے)۔ ایک عورت اگر زانیہ رہی ہو تو مسلمانوں کے لیے اُس کے ساتھ نکاح کرنا حرام نہیں زنا حرام ہے۔ پس اس آیت میں نکاح سے عقد شرعی مراد نہیں۔ ابن عباس سے بھی یہی معنی مروی ہیں جو ابو مسلم نے بیان کیے ہیں۔ ان معانی کو صحیح تسلیم کیا جائے تو نسخ کا احتمال بھی ختم ہو جاتا ہے اور آیت پر بھی کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

17- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا يَسْتَأْذِنُكُمُ الَّذِينَ مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ

وَالَّذِينَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ مِّن قَبْلِ صَلَاةِ

الْفَجْرِ وَحِينَ تَضَعُونَ ثِيَابَكُمْ مِنَ الظَّهْرِ وَمِن بَعْدِ صَلَاةِ

الْعِشَاءِ ط ثَلَاثُ عَوْرَتٍ لَّكُمْ ط لَيْسَ عَلَيْكُمْ وَلَا عَلَيْهِمْ جُنَاحٌ
بَعْدُهَا ط طَوَّافُونَ عَلَيْكُمْ بَعْضُكُمْ عَلَى بَعْضٍ ط (58:24)

اے بیروانِ دعوتِ ایمانی جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک
ہوئے اور وہ جو تم میں سے بلوغ کو نہیں پہنچے، چاہیے کہ تین مرتبہ تم سے
اندر آنے کی اجازت لے لیا کریں۔ نماز فجر سے پہلے اور جب تم دوپہر کو
کپڑے تبدیل کر لیتے ہو اور نمازِ عشا کے بعد، تین وقت تمہارے پردے
کے ہیں۔ ان کے بعد نہ تم پر کوئی گناہ ہے اور نہ اُن پر کوئی گناہ ہے، تم ایک
دوسرے کے پاس پھرتے ہی رہتے ہو۔

اس آیت کو بھی منسوخ کہا جاتا ہے لیکن اس کا نسخ بیان نہیں کیا جاتا۔ اصل میں اس
آیت کے نسخ پر کوئی دلیل نہیں بلکہ یہ تو بلند اخلاق ہیں جو اللہ نے انسانوں کو سکھائے تاکہ بتائے
ہوئے اوقات میں ان کے غلام اور نابالغ لڑکے بغیر اجازت داخل نہ ہوں، معلوم نہیں اس سے نسخ
کا پہلو کہاں سے پیدا ہو گیا۔

18- يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ الَّتِي آمَنَتْ
أُجُورَهُنَّ. (80:33)

اے نبی! ہم نے تیرے لیے تیری وہ بیویاں جائز کر دیں
جنہیں تو نے اُن کے مہر دیے۔

اور

لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ
أَزْوَاجٍ.

اس کے بعد تیرے لیے اور عورتیں نکاح میں لانا جائز نہیں اور
نہ یہ کہ تو ان کی جگہ دوسری بیویاں بدل لے۔

مفسرین ان دونوں آیتوں میں بھی نسخ کے قائل ہیں۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ:

”پہلی آیت میں نبی کو پوری اجازت دی گئی ہے کہ جن عورتوں کو بھی وہ مہر دیں وہ اُن کے نکاح میں آسکتی ہیں اور دوسری آیت میں مزید نکاح سے بھی منع کیا گیا ہے اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ آپ ایک بیوی کو طلاق دے کر اُس کی جگہ کسی اور بیوی سے نکاح بھی نہیں کر سکتے۔ دونوں قسم کے احکام ایک دوسرے کے خلاف ہیں، اس لیے ان میں نسخ ہے۔“

لیکن ان میں بھی نسخ تسلیم کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ پہلی آیت میں یہ کہا گیا کہ جو بیویاں آپ کے گھر موجود ہیں وہ آپ پر حلال ہیں اور دوسری آیت میں آئندہ نکاح کرنے سے ممانعت کر دی گئی۔ اصل بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب تعدد ازواج کی اجازت دیتے وقت چار کی حد مقرر کر دی گئی، تو دوسرے مسلمانوں نے جن کے ہاں چار سے زائد بیویاں تھیں چار بیویاں قید نکاح میں رہنے دیں اور زائد کو طلاق دے دی۔ یہ مطلقہ عورتیں دوسرے مردوں کے ساتھ شادی کر سکتی تھیں۔ اس لیے کوئی دشواری پیدا نہ ہوئی۔ لیکن رسول خدا کے معاملے میں یہ مشکل تھی کہ اگر آپ چار بیویوں کو رہنے دیتے اور باقی کو طلاق دے دیتے تو ان مطلقہ ازواج مطہرات کے ساتھ کوئی اور مسلمان شادی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کتاب اللہ نے انہیں امہات المؤمنین (مسلمانوں کی مائیں) قرار دے دیا تھا۔ اس لیے نبی کے معاملہ میں خصوصیت کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا تھا کہ چار سے زائد ازواج مطہرات کے ساتھ کیا کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ ”اے نبی! ہم نے تیرے لیے وہ بیویاں جائز کر دی ہیں جنہیں تو نے اُن کے مہر ادا کیے۔“ یعنی پہلے سے جو بیویاں موجود ہیں وہ حلال ہیں۔ لیکن ساتھ ہی اللہ نے آئندہ نکاح کرنے سے منع فرمادیا۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدِّلَ بَیْنَهُنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ۔ آیت کے آخری ٹکڑے پر غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ پر ایک ایسی پابندی عائد کی ہے جو دوسرے مسلمانوں پر نہیں۔ دوسرے مسلمان بیویاں تبدیل کر سکتے ہیں یعنی اگر ایک شخص کے پاس چار بیویاں ہیں تو وہ یہ کر سکتا ہے کہ ان میں سے ایک کو جائز طریقہ سے طلاق دے دے اور اس کی بجائے کسی اور عورت سے نکاح کر لے۔ لیکن نبی کے لیے واضح حکم ہے وَلَا اَنْ

تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ - اس حکم میں اُس علت کی طرف صریح اشارہ ہے جو ہم نے بیان کی ہے کہ اس میں دراصل ازواجِ مطہرات کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے کیونکہ اگر انہیں طلاق دی جاتی تو وہ کسی اور مسلمانوں سے نکاح نہیں کر سکتی تھیں۔

اس تفسیر سے واضح ہو گیا کہ دونوں آیات میں کوئی اختلاف نہیں۔

19- يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَةٌ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَأَطْهَرُ ۚ فَإِنْ لَّمْ تَجِدُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ. (12:58)

اے پیروانِ دعوتِ ایمان جب تم رسول سے علیحدہ بات چیت کرو تو اپنے مشورہ سے پہلے صدقہ دے لیا کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور زیادہ پاکیزگی کا موجب ہے۔ پھر اگر تم نہ پاؤ تو اللہ مغفرت کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اس کو متصل بعد والی آیت سے منسوخ سمجھا جاتا ہے۔ ءَ اَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَتٍ ۚ فَاِذَا لَمْ تَفْعَلُوا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فَاَقِمْوْا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ وَاطِيعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ (کیا تم ڈر گئے؟ کہ اپنے مشورہ سے پہلے صدقہ دیا کرو۔ تو جب تم نے ایسا نہ کیا اور اللہ نے تم پر رجوعِ برحمت کیا ہے تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو)۔ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ صدقہ کا حکم وجوبِ زکوٰۃ کے حکم سے منسوخ ہوا۔ پھر کوئی کہتا ہے پہلی آیت کا حکم دس روز قائم رہا تھا، کوئی کہتا ہے صرف ایک گھڑی، کوئی کہتا ہے کہ عمل سے پہلے اُسے منسوخ کر دیا گیا، لیکن اگر غور کیجیے دونوں آیتوں میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ پہلی آیت میں بھی صدقہ دینے کے حکم کے ساتھ اللہ نے فرمایا اگر صدقہ نہ دے سکو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ دوسری آیت میں بھی یہی کہا گیا کہ اگر تم ایسا نہ کرو تو اللہ تعالیٰ اس پر گرفت نہیں کرتا۔ چنانچہ فَاِذَا لَمْ تَفْعَلُوا کے بعد ہے وَتَابَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ۔ پس دونوں کا ماحصل ایک ہے جو دینا چاہے اُسے دینا افضل ہے اور جو نہ دے تو اللہ اُس پر کوئی گرفت نہیں کرتا۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ دوسری آیت پہلی آیت کی تشریح کرتی ہے اُسے منسوخ نہیں کرتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو اسے

فرضیت زکوٰۃ کے ساتھ منسوخ تسلیم کرتے ہیں تو ان کا قول اور بھی زیادہ ضعیف ہے۔ کیونکہ مشورے کے صدقے کا زکوٰۃ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

20- فَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ أَرْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَابْتُمْ

فَاتُوا الَّذِينَ ذَهَبَتْ أَرْوَاجُهُمْ مِثْلَ مَا أَنْفَقُوا. (11:6)

اور اگر تمہاری عورتوں کے مہروں سے کچھ تم سے نکل کر کافروں کی طرف چلا گیا ہے۔ پھر تمہاری باری آئے تو ان لوگوں کو جن کی عورتیں چلی گئی ہیں اس کی مثل دے دو جو انہوں نے خرچ کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی مسلمان کی بیوی اگر کافر تھی اور وہ الگ ہو گئی تو جب تمہاری باری آئے اور کسی کافر کی عورت مسلمان ہو کر آجائے تو جو مہر کفار کی طرف لوٹا تھا اُسے اُس مسلمان کو دے دو، اس آیت کو آیت غنیمت سے منسوخ کہا گیا ہے۔ لیکن دونوں آیتوں کے موضوع میں بہت بُعد ہے اسی لیے بہت کم مفسرین نے اسے منسوخ کہا ہے۔ حق یہ ہے کہ یہ آیت اپنی جگہ پر محکم ہے اور جب بھی اس قسم کے حالات پیدا ہوں گے اسی پر عمل کیا جائے گا۔

21- يٰٓأَيُّهَا الْمَرْمَلُ. قُمْ الْبَيْلَ إِلَّا قَلِيلًا. نِصْفَهُ أَوْ انْقُصْ مِنْهُ

قَلِيلًا. أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا (1-4:73)

اے ساتھی تیار کرنے والے! رات کو قیام کر سوائے تھوڑے حصہ کے یعنی اس کا آدھا یا اس سے کچھ کم کر یا اس پر بڑھالے اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔

تائیلن نسخ کہتے ہیں کہ اس کی نسخ وہ آیات ہیں جو اسی سورت کے آخری حصہ میں وارو ہیں:

إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِنْ ثُلَاثِي إِلَيْهِ وَنِصْفَهُ وَتُلْثُهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ ۚ وَاللَّهُ يُقَدِّرُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ عَلِمَ أَنْ لَّنْ نَّخْصُوهُ فَتَابَ عَلَيْكُمْ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۚ عَلِمَ أَنْ سَيَكُونُ مِنْكُمْ مَّرْضَىٰ ۚ وَآخَرُونَ يَضْرِبُونَ فِي الْأَرْضِ

يَبْتَغُونَ مِنْ فَضْلِ اللَّهِ وَآخَرُونَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَأَقْرَرُوا
مَا تَيْسَّرَ مِنْهُ. (20:73)

تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب قیام کرتا
ہے۔ اور کبھی اس کا نصف اور کبھی اس کی تہائی اور ان میں سے بھی ایک
گروہ جو تیرے ساتھ ہیں اور اللہ رات اور دن کا اندازہ کرتا ہے وہ جانتا
ہے کہ تم اس کی حفاظت نہ کر سکو گے سو وہ تم پر رجوع برحمت کرتا ہے۔ پس
قرآن سے جو بات بھی پڑھ سکتے ہو پڑھو، وہ جانتا ہے کہ تم میں سے بیمار
ہوں گے اور دوسرے لوگ جو زمین میں سفر کریں گے اللہ کے فضل کو تلاش
کرتے ہوں گے اور دوسرے جو اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے سو پڑھو جو
اس سے آسانی پڑھ سکو۔

قاتلینِ نِخ کا استدلال یہ ہے کہ پہلی آیت میں نصف رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے
کچھ زیادہ کے قیام کا حکم کیا گیا ہے کہ ”آپ نصف رات، یا تہائی رات یا دو تہائی رات تک کے
لیے قیام کرتے ہیں اور مسلمانوں کا ایک گروہ بھی آپ کے ساتھ ہوتا ہے چونکہ ان پر مداومت نہ
ہو سکے گی پس اللہ تعالیٰ تخفیف کرتا ہے اب آپ آسانی سے رات کے جس قدر حصہ میں قیام
کر سکیں کر لیں۔“ اس تخفیف سے نِخ ثابت ہوتا ہے۔

آیت کے غیر منسوخ ہونے پر درج ذیل دلائل ہو سکتے ہیں:

1- سورہ مزمل کے پہلے اور آخری حصہ کے نزول میں حضرت عائشہ کی روایت کے مطابق
بارہ مہینوں کا عرصہ حائل ہے۔ اس لیے بارہ مہینے پہلے اور بارہ مہینے بعد کے حالات
میں بہت سافرق ہوگا۔ پہلی آیت میں نبیؐ کو یَسْأَلُهَا الْمُسْلِمُ کہہ کر مخاطب کیا۔
الزمیل کے معنی ہیں اونٹ پر بیٹھنے والا آدمی یا سفر کا ساتھی جو معاملات میں مدد کرتا
ہے۔ زَمَلَهُ، يَزْمِلُهُ، زَمَلَا کے معنی ہیں اُس نے پیچھے ساور کر لیا یا کجاوے میں
اپنے ساتھ برابر کی جھولی میں بٹھایا۔ الزمِلُ کے معنی ہیں ”إِزْدَمَلَ الْحَمْلُ“ کے
معنی ہیں اُس نے ایک ہی دفعہ سارے بوجھ اٹھالیا۔ المزاملہ اونٹ پر دونوں طرف

ہم وزن سوار یوں کا بیٹھنا یا ہم وزن بوجھ لادنا کے معنوں میں آتا ہے۔ پس ”يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ“ کے معنی ہوئے اے بار رسالت کو اٹھانے والے، اے سرِ عظیم اٹھانے والے یا اے سفر کے ساتھی انتخاب کرنے والے۔

چونکہ ان آیات میں رنقا کی تربیت مقصود ہے اس لیے رات کے زیادہ حصہ کے قیام پر زور دیا گیا ہے۔ دوسری آیات اُس وقت کی ہیں جب تربیت کا مرحلہ گزر چکا تھا اس لیے انسانی معذوریوں کو مد نظر رکھ کر حکم میں تخفیف کر دی گئی۔ چونکہ دونوں آیات کے نزول کے وقت حالات مختلف تھے اس لیے دونوں آیات اپنی اپنی جگہ پر محکم ہیں۔ اگرچہ آج بھی کسی کو اپنے رنقا کی تربیت مقصود ہوگی تو وہ پہلی آیت پر عمل کرے گا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو جائے گا تو دوسری آیت پر عمل ہوگا۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اصل وجوب رات کا قیام ہے اور قیام کا وقت اللہ تعالیٰ نے اختیار پر چھوڑ دیا ہے۔ پہلی آیت میں ”نصفه“، ”وَانْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا“، ”او زِدْ عَلَيْهِ“ کے الفاظ ای اختیار پر ہی دلالت کرتے تھے اور رسول اکرمؐ نے اُس اختیار کو اس طرح استعمال کیا کہ نصف کے معنی نصف ہی لیے ”وَانْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا“ کے معنی ایک تہائی رات لیے اور ”او زِدْ عَلَيْهِ“ سے دو تہائی رات مراد لی۔ چونکہ آپ عبادت کے لیے بہت زیادہ کوشش فرماتے تھے اور آپ کو عبادت کا شوق تھا اس لیے آپؐ نے رات کو زیادہ وقت کا قیام مناسب خیال کیا جب دوسرے مسلمان بھی رات کے قیام میں آپ کے شریک ہو گئے ”وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ“ تو اللہ تعالیٰ نے عام انسانی مجبوریوں کو مد نظر رکھتے ہوئے فیصلہ فرما دیا کہ ہر آدمی کو اختیار ہے کہ وہ اپنی طاقت کے مطابق قیام کرے۔

یہ دلیل بھی ہو سکتی ہے کہ پہلا حکم انفرادی ہے اور دوسرا حکم اجتماعی ہے، کیونکہ وہاں ”وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ“ کے الفاظ آئے ہیں۔ پس پہلا حکم ایک خاص وقت تک کے لیے تھا۔ وہ وقت گزر گیا تو حکم بھی ختم ہو گیا اور جب نبی کے ساتھ مسلمانوں کا گروہ بھی قیام شب میں شریک ہوا تو دوسرے احکام نازل ہوئے۔ آج بھی اگر کوئی انہی

خطوط پر کام کرے گا تو پہلے انفرادی حکم پر عمل کرے گا پھر اجتماعی پر۔ وگرنہ دوسرے حکم میں جو مصالح اور علل بیان ہوئی یقیناً پہلا حکم دیتے وقت بھی اللہ کے پیش نظر ہوں گی۔ اصل وجہ قیام شب کا ہے اور دونوں طرح برقرار ہے، باقی رہا یہ امر کہ پہلے رات کے زیادہ حصہ میں قیام کا حکم تھا اور پھر اسے کم کر دیا گیا تو اس کی علت یہ ہے کہ یہ حکم حسب استطاعت ہے۔ اسی طرح دوسری آیت پہلی آیت کی تشریح و توضیح کر رہی ہے، اسے منسوخ نہیں کر رہی۔

جو لوگ ناخ منسوخ کے قائل ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا ہر حکم مصلحت پر مبنی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانہ کے تغیر کے ساتھ مصلحت بھی بدل جاتی ہے اور تدریجی ارتقا کے سلسلہ میں مختلف مقامات آتے ہیں اور ان کی مصالح کے پیش نظر تدریجی احکام صادر ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات نہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ (معاذ اللہ) اللہ نے ایک وقت میں بے سوچے سمجھے ایک حکم دے دیا پھر بارہ مہینوں کے بعد اسے معلوم ہوا کہ ”میرا فیصلہ (نعوذ باللہ) غلط تھا“ پھر اس کے خلاف دوسرا حکم صادر کر دیا۔

22- فَأَيِّنَّمَا تُولُوا فَتَمَّ وَجْهُ اللَّهِ. (115:2)

پس جدھر تم پھرو گے بس وہیں پاؤ گے منہ اللہ کا۔

اس آیت کو تحویل قبلہ والی آیت سے منسوخ سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس آیت میں قبلہ کا کوئی ذکر نہیں۔ چونکہ اس سے پہلے کی آیت میں بتایا گیا کہ مسلمانوں کو مساجد سے یا خدا کی عبادت سے روکا جاتا ہے اس لیے یہاں مسلمانوں کو تسلی دی کہ اگر انہیں خانہ کعبہ سے روکا گیا تو اللہ کی توجہ صرف خانہ کعبہ پر محدود نہیں، وہ جہاں جائیں گے اللہ کی توجہ وہیں ان کے ساتھ ہوگی۔ اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ مسلمان جدھر جائیں گے اللہ کی توجہ سے فتح و ظفر ان کے ہم رکاب ہوگی۔ کیونکہ مشرق و مغرب کا حقیقی مالک اللہ ہے۔ پھر اگر ”فَأَيِّنَّمَا تُولُوا“ سے صلوٰۃ میں منہ پھیرنا ہی مراد لیجیے تب بھی آپ آیت کو منسوخ نہیں کہہ سکتے۔ ہم کہیں گے کہ وہ خاص حالات سے مخصوص ہے۔ جب آدمی کو قبلہ کی سمت معلوم نہ ہو تو جدھر بھی وہ چاہے منہ کر کے صلوٰۃ ادا کر سکتا ہے۔ پس یہ آیت اپنے حکم میں باقی ہے۔

یہ ہیں وہ مقامات جہاں امام جلال الدین سیوطیؒ نے نسخ تسلیم کیا۔ ان میں سے بھی دو کو خود امام سیوطیؒ نے ساقط کر دیا ہے۔ باقی میں آیات آپؐ نے دیکھ لیں کہ ابو مسلم نے اُن کی تشریح بھی کر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جب قرآن میں نسخ نہیں تو آخر اُس آیت کا کیا مفہوم ہے جو اس کی ابتدا میں درج کی گئی ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلَهَا.

ہم جس آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں تو کوئی

اس سے بہتر یا اس کے مثل لے آتے ہیں۔

ابو مسلم اس آیت کی تفسیر میں نئی راہ نکالتے ہیں۔

سب سے پہلے اُن الفاظ پر غور کیجیے جن میں قائلین نسخ استدلال کرتے ہیں۔

نَسَخَ کے معنی ہیں ایک چیز کو ختم کر دینا، مٹا دینا اور اُس کی جگہ دوسری چیز لے آنا۔

دوسری چیز کو پہلی چیز کا قائم مقام کر دینا۔ نَسَخَتِ الشَّمْسُ الظِّلَّ کے معنی ہیں سورج نے

سایہ کو ختم کر دیا، اور اس کی جگہ روشنی لے آیا۔ کسی چیز میں تغیر کر دینے کا مفہوم ادا کرنے کے لیے

بھی یہی لفظ استعمال ہوتا ہے نَسَخَتِ الرِّيحُ اَثَارَ الدِّيَارِ ہوانے آبادی کے آثار کو تبدیل

کر دیا نَسَخَ الْكِتَابَ ایک کتاب کو نقل کر کے اس جیسی دوسری کتاب بنانا۔ اسی سے النسخہ

ہے جو منقول کتاب کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ لہذا ”النسخ“ کے اصلی معنی ایک چیز کی

جگہ دوسری چیز لانا ہیں۔

”نَسِيَانٌ“ کے معنی ہیں ترک کر دینا، چھوڑ دینا، حفاظت سے ہاتھ اٹھا لینا۔

”النَّسِيءُ“ ایسی چیز کو کہتے ہیں جسے حقیر اور غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ اس

کی جمع ”النِّسَاءُ“ ہے۔ جب عربوں کا قافلہ کوچ کرنے لگتا تو وہ پکارتے تَتَّبِعُوا اَنْسَاءَكُمْ

اپنی اُن چھوٹی چھوٹی اور حقیر چیزوں کو بھی تلاش کر لو جنہیں اہمیت نہیں دی جاتی۔ اس عدم اہمیت

کی بنا پر اس لفظ کے معنی فراموش کر دینے اور بھول جانے کے ہو گئے۔ ”اَنْسَاةً اَيَّاهُ“ اُس نے

اس کو بھلا دیا۔ نِسَاءٌ بہت بھول جانے والا۔ نَسِيًا مِّنْ سِيَا کے معنی ہوئے بھولی بھری۔

ان توضیحات کے بعد اب قائلین نسخ کے بتائے ہوئے مفہوم پر غور کیجیے۔ اس مفہوم

سے یہ لازم آتا ہے کہ قرآن حکیم میں بیشتر احکام ایسے تھے جنہیں اللہ تعالیٰ نے یا تو بدل دیا اور یا پھر نبیؐ کے حافظہ سے بھلا دیا۔ ان احکام کی بجائے اللہ نے یا تو دوسرے احکام صادر کر دیے یا انہیں جیسے احکام پھر سے نازل کیے گئے۔ (فَاتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلَهَا)۔

”أَوْ مِثْلَهَا“ کے مفہوم پر غور کیجیے۔ اگر پھر خدا کو ویسے ہی احکام صادر کرنے تھے تو پہلے احکام کو منادینے یا بھلا دینے کی کیا ضرورت تھی۔ نسخ سے یہ عقیدہ لازماً پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا یہ حال ہے کہ وہ ایک وقت میں ایک حکم صادر کرتا ہے لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ حکم معاذ اللہ غلط تھا اس لیے وہ حکم خدا منسوخ کر دیتا ہے اور اُس کی جگہ دوسرا حکم دے دیتا ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ قرآن حکیم میں خدا نے کوئی تصریح بھی نہیں کی کہ فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ ہے۔ نہ ہی سرورِ کائناتؐ نے واضح فرما دیا کہ قرآن حکیم کی فلاں آیت فلاں آیت سے منسوخ ہوگئی۔

اب اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھیے۔

پچھپے سے سلسلہ کلام یوں چلا آتا ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود قرآن حکیم اور رسالت محمدیہ پر اعتراضات کے سلسلہ میں یہ بھی کہتے کہ جب خدا نے پچھلے انبیاء پر احکام نازل فرما دیے اور وہ احکام توریت میں محفوظ بھی ہیں تو نئے نبیؐ کی کیا ضرورت تھی کہ انہیں نئے احکام دے کر بھیجا گیا؟ یہ آیت اسی اعتراض کے جواب میں وارد ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ جواب دیا گیا ہے کہ ٹھیک ہے کہ انبیاء کا سلسلہ رشد و ہدایت مسلسل چلا آ رہا ہے مگر اس کی صورت یہ رہی ہے کہ مختلف انبیاء کی وساطت سے جو احکام نازل ہوتے تھے ان میں سے کچھ وقتی ہوتے تھے اور خاص قوم اور خاص حالات کے لیے ان کا نزول کیا جاتا تھا۔ بعد میں جب وہ قوم نہ رہتی یا زمانے کے تقاضے بدل جاتے تو ایک اور رسول آتا اور وہ ان وقتی احکام کی جگہ دوسری قوم کے حالات کے مطابق احکام لے آتا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائے تو توریت کے بہت سے احکام بدل گئے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسانیت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے اس لیے ہر زمانے میں اُس وقت کی ارتقائی سطح کے مطابق احکام نازل کیے گئے اور جو احکام اس سطح سے بلند ہوتے انہیں آئندہ وقت کے لیے روک لیا جاتا۔

پس آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ سابقہ انبیاء کے وہ تمام قوانین جو وقت اور حالات سے مقید تھے انہیں منسوخ کر دیا گیا ہے اور اب چونکہ انسانیت ترقی کے راستے طے کرتی ہوئی اس منزل پر پہنچی ہے اس لیے اسے ایک ابدی ضابطہ حیات دے دیا گیا ہے۔ اس ضابطہ حیات میں پچھلی شریعتوں کے کچھ احکام کو منسوخ کر دیا گیا ہے اور کچھ کو علیٰ حالہ باقی رکھا گیا ہے۔ آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہوگا:

”پچھلی شریعتوں کے احکام کو ہم منسوخ کر دیتے ہیں یا ترک کر دیتے ہیں تو اس کی جگہ اس سے بہتر، اس جیسا کوئی اور حکم لے آتے ہیں۔“

آیت کا اگلا حصہ ہے إِنَّ اللَّهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، خدا کے ہاں ہر بات کے اندازے مقرر ہیں یعنی خدا جانتا ہے کہ انسانوں کے کس زمانے میں کس قسم کے احکام ملنے چاہئیں اور وہ دور کب آئے گا جب اسے مکمل نظام زندگی دے کر اسے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا جائے۔

یہ ہے نسخ منسوخ کا صحیح مفہوم، جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اس میں ایک لفظ بھی منسوخ نہیں، اس کے تمام احکام اپنی جگہ محکم اور غیر متبدل ہیں کیونکہ پچھلی نبوتیں کسی خاص قوم سے تعلق رکھتی تھیں اور سرور کائنات کی نبوت تمام اقوام عالم کے لیے ہے اور قیامت تک کے لیے ہے۔

اب رہا تائیلین نسخ کا یہ اعتراض کہ آیہ زیر بحث میں ”آیت“ کے منسوخ ہونے کا ذکر ہے اور ”آیت“ کا لفظ صرف قرآنی ”آیات“ پر ہی بولا جاتا ہے۔ پچھلے احکام پر استعمال نہیں ہوتا تو یہ دلیل محض بے معنی ہے، اللہ کے تمام احکام کو ”آیات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قصہ آدم کے سلسلہ میں اللہ نے آدم سے ارشاد کیا:

فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هُدًى فَمَنْ تَبَعَ هَذَا فَلَاَخَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ. وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا..... (2:38-39)

جب بھی میری طرف سے تمہارے پاس کوئی ہدایت آئے تو جو اس کی اتباع کرے گا اُسے کوئی خوف اور حزن نہیں ہوگا اور جو لوگ ہماری ”آیات“ کی تکذیب کریں گے اور ان کا انکار کریں گے..... یہاں سے ظاہر ہے کہ جب بھی خدا کی طرف سے ہدایت آئی اُسے ”آیات“ سے تعبیر کیا گیا۔

قَاتِلِينَ نَخْ سُوْرَهٗ نَخْلِیْ کِی اِس آیت سے بھی استدلال کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَ اِذْ بَدَلْنَا اٰیَةً مَّکَانَ اٰیَةٍ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُنْزِلُ قَالُوْۤا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ

اور جب ہم ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم بھیجتے ہیں اور اللہ بہتر جانتا ہے جو وہ اتارتا ہے تو کہتے ہیں تو تو افتر کرنے والا ہے۔

غور کیجیے تو یہ استدلال بھی کمزور ہے، باوئی تدبیر یہ بات معلوم ہو سکتی ہے کہ قرآنی آیات کے نسخ کا یہاں کوئی ذکر نہیں۔ اس کے لیے ہم چند دلائل بیان کرتے ہیں:

(الف) یہ قول کفار کا ہے اس لیے انہیں تو اس سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ کہیں کہ آج کون سا قرآنی حکم منسوخ ہوا اور کون سا حکم قائم ہوا۔

(ب) سیاق و سباق میں نسخ منسوخ کی کسی بحث کا ذکر نہیں اصل موضوع ہے کفار کے مقابلہ میں وحی کی صداقت کو ثابت کرنا۔ اس سے اگلی آیت (103:16) میں کفار کا واضح قول ذکر کیا گیا ہے کہ ”ایک بشر آپ کو سکھاتا ہے۔“

(ج) یہ سورت مکی ہے اور جن آیات کو نسخ شمار کیا گیا ہے وہ تمام مدینہ میں نازل ہوئی تھیں جب مکہ میں شریعت کے تفصیلی احکام نازل ہوئے تو منسوخ کون سی چیز ہوئی اور یہ اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ اس آیات میں قرآن کے نسخ منسوخ کا ادنیٰ اشارہ بھی نہیں ملتا۔

(و) اس سے متصل بعد والی آیت میں اس کے نزول کی غرض یہ بتائی گئی یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ هٰذِیْ وَ بُشْرٰی لِّلْمُسْلِمِیْنَ. (102:16) (تاکہ انہیں مضبوط کرے جو

ایمان لائے اور وہ فرماں برداروں کے لیے ہدایت اور خوش خبری ہے)۔ یہ ایک آیت کی نہیں بلکہ تمام قرآن کی شانِ نزول ہے جیسا کہ سورۃ الفرقان میں فرمایا ”لِنُنَبِّئَكَ بِهِ فُؤَادَكَ“۔ پس یہاں ”آیت کے بدلنے سے نئی رسالت کا آنا مراد ہے اور اس پر قرینہ یہ ہے کہ اس سے پیشتر دوسرے انبیاء کا ذکر کیا تھا جو اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوئے (6: 84، 69: 89) اب کفار کی طرف سے یہ اعتراض پیدا ہوا کہ جب پہلے انبیاء آچکے تھے تو نئی کتاب اور نئے رسول کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ اس نے پچھلی شریعتوں کو منسوخ کر دیا۔“ اس لیے انہوں نے کہا کہ یہ تو بہر حال افترا ہے اس کا جواب دیا کہ قُلْ نَزَّلَهُ رُوحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ (16: 102) (فرما دیجیے کہ اس کو روح القدس نے آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ اتارا ہے)۔

پس اس آیت میں بھی آیت کی تبدیلی سے مراد پچھلی شریعتوں کے احکام کی تبدیلی

ہے۔

قائلین نسخ کی اور دلیل بھی سن لیجیے۔ وہ کہتے ہیں کہ نسخ والی آیت میں جہاں ”أَوْ نُنسِئَهَا“ آیا ہے، اس کا واضح مفہوم یہی ہے کہ نبی اکرم کچھ آیات بھول جاتے تھے اس پر یہ آیت دلیل ہے ”سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَى إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ“ (87: 17) اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے (ہم تجھے پڑھائیں گے سو تو نہ بھولے گا، ہاں مگر جو اللہ چاہتا ہے)۔

اس استدلال کا جواب ہے کہ ان لوگوں نے ”إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ“ کا مفہوم نہیں سمجھا، اس فقرہ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ایسا ہو سکتا تھا کہ تو کچھ بھول جائے لیکن اللہ کی یہ مشیت نہیں۔ دوسری جگہ اس مفہوم کو ایک اور انداز سے بیان کیا گیا ہے:

وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ (17: 86)

اور اگر ہم چاہیں تو جو کچھ بذریعہ وحی دیا گیا ہے اُس میں سے

کچھ لے جائیں (لیکن ہماری مشیت ایسی نہیں)۔

اصل یہ ہے کہ ”استثناء بالمشیت“ قرآن میں ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لیے آتا

ہے۔ یعنی جہاں اِلَّا کے بعد مَا شَاءَ اللّٰہ وغیرہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جیسا پہلے کہہ دیا گیا ہے اس کے خلاف کبھی نہیں ہوگا۔ اس کی دلیل وہ آیت ہے جس میں فرمایا گیا ہے:

وَأَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ
السَّمُوتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ عَطَاءٌ غَيْرَ
مَجْذُوزٍ۔ (108:11)

اور وہ جو خوش قسمت ہیں وہ جنت میں ہوں گے، اُسی میں
رہیں گے جب تک آسمان اور زمین ہیں مگر جو تیرا رب چاہے، یہ بخشش
ہے جو کبھی منقطع نہیں ہوگی۔

پس یہاں ”إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ“ کا مفہوم وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا ہے۔
قابلینِ نِسخ کے یہی کچھ دلائل تھے جنہیں رد کر دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ اُن کے پاس
اور کوئی دلیل نہیں۔

أَمْ تُرِيدُونَ كَيْفَ يُخَاطَبُ كَوْنٌ؟

أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَى
مِنْ قَبْلُ ۚ (108:2)

بلکہ تم تو یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے سوال کرو جیسے سوالات
پیش ازیں موسیٰؑ سے کیے گئے۔

عام مفسرین کا خیال ہے کہ اس آیت میں یہود سے خطاب کیا گیا ہے نزلت فی
اليهود (معالم التنزيل)۔ دوسرے قول بھی نقل کیے گئے ہیں لیکن راجح قول یہی سمجھا گیا ہے۔
”وَرَجَعَ إِلَيْهِمُ الْيَهُودُ“ (بحر) لیکن اصم، جبائی اور ابو مسلم کے نزدیک مخاطب مسلمان ہیں۔
انہوں نے کئی وجہ سے استدلال کیا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ آیت کے آخر میں فرمایا گیا:

وَمَنْ يَتَّبِعِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ
السَّبِيلِ۔

اور جو کوئی ایمان کو کفر سے بدل لے گا سو وہ یقیناً سیدھی راہ

سے بھٹک گیا۔

اور یہ کلام مسلمانوں کے سوا کسی کے حق میں صحیح نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہود یا مشرکین وغیرہ کے لیے تو ایمان کو کفر سے بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اَمْ تُرِيدُونَ کے لیے معطوف علیہ کی ضرورت ہے اور وہ لَا تَقُولُوا رَاعِنَا ہے پس گویا یوں فرمایا کہ:

”وَقُولُوا انظُرْنَا وَاسْمَعُوا فَبَل تَفْعَلُونَ ذَلِكَ كَمَا

أَمَرْتُمْ اَمْ تَرِيدُونَ اَنْ تَسْتَلُوا رَسُولَكُمْ.“

تیسری وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ایک ضعیف الاعتقاد گردہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ ان کے لیے کوئی درخت مقرر فرمادیں، جیسا مشرکوں کے لیے ذاتِ انواط تھا، جس کو وہ پوجتے تھے اور اُس پر کھانے پینے کی چیزیں لٹکا آتے تھے، ایسا ہی سوال بنی اسرائیل نے بھی حضرت موسیٰ سے کیا تھا اجعل لنا الہ کَمَا لَہُم الہ۔

سب سے بڑا ظلم

وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ مَنَعَ مَسْجِدَ اللَّهِ اَنْ يُذْكَرَ فِيْہَا اسْمُہٗ وَسَعٰی

فِیْ خَوَابِہَا ؕ (117:2)

اور اُس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو روک دے اللہ کی مسجدوں

میں اُس کا نام لینے سے اور اُن کی بربادی کی کوشش کرے۔

ابو مسلم کے نزدیک یہ مشرکین مکہ کی طرف اشارہ ہے جنہوں نے واقعہ حدیبیہ میں

مسلمانوں کو مسجد حرام تک جانے سے روکا تھا۔

دوسری جگہ انہی لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا

وَصَدَّوْکُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ رہا یہ سوال کہ مساجد جمع ہے پھر اُسے واحد کے معنوں میں

لے کر مسجد حرام کیوں مراد لی گئی تو اس کا جواب یہ ہے کہ محاورہ زبان میں یہ جائز ہے۔ مثلاً اگر کوئی

آدی کسی نیک آدمی کو ستائے تو کہا جاتا ہے نیکوں کو ستانے والا بڑا ظالم ہے۔

کَمَا تَقُولَ لِمَن اٰذَى صَالِحًا وَّاحِدًا وَمِنَ الظَّالِمِ مَمْنٌ

اَذَى الصّٰلِحِيْنَ۔

مشرق و مغرب اللہ کے ہیں

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ. (115:2)

آپ کہہ دیجیے کہ مشرق و مغرب اللہ کے ہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں یہود اور نصاریٰ میں سے ہر ایک کا یہی خیال تھا کہ جنت اُن کے سوا کسی کے حصہ میں نہ آئے گی۔ اللہ تعالیٰ اس آیت سے اُن کے اقوال کا ابطال کرتا ہے۔ یہود بیت المقدس (مغرب) کی طرف صرف اس لیے منہ کرتے تھے کہ اُن کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ صحرہ بیت المقدس سے ہی آسمان پر چڑھتا تھا، اور عیسائی جو عیسیٰ علیہ السلام کو (نعوذ باللہ) اللہ کا بیٹا سمجھتے تھے، صرف اس لیے مشرق کو قبلہ قرار دیتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام مشرق میں پیدا ہوئے تھے جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے:

وَ اذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ اِذْ اتَّخَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا

شَرْقِيًّا.

مریم کے حالات یاد کرو جب کہ وہ گھر والوں سے الگ مشرقی

مکان میں گئی۔

پس ان دونوں فریقوں نے اپنے اپنے معبودوں کو خاص خاص مکان میں مقید سمجھا ہے اور جس کی صورت ایسی ہو وہ تو مخلوق ہوگا، خالق تو نہ زمان میں مقید ہے نہ مکان میں، بلکہ یہ جہات اُس کی ملک ہیں۔

تحویل قبلہ

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مَا وَلَّهُمْ مِّنْ قِبَلَتِهِمُ الْبَيْتُ كَانُوا

عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ اِلَى

اب بے وقوف لوگ ضرور کہیں گے کہ کس چیز نے مسلمانوں کو اُس قبلہ سے پھیر دیا جس پر وہ اب تک تھے، فرما دیجیے کہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں وہ جس کو چاہے سیدھی راہ پر چلا دیتا ہے۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ اگر روایت میں صاف طور پر مذکور نہ ہوتا کہ اللہ نے حضور کو بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کی طرف منہ پھیرنے کا حکم دیا تو آیت کے الفاظ کَانُوا عَلَيْهَا اس بات پر بھی محمول کیے جاسکتے تھے کہ ”وہ قبلہ جس پر بے وقوف تھے“ کیونکہ وہ مشرق و مغرب ان دو قبلوں کے سوا کسی قبلہ سے واقف نہ تھے، اور جب انہوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو کعبہ کی طرف منہ کرتے دیکھا تو متعجب ہوئے کہ ان دو جہتوں کو چھوڑ کر یہ تیسرا قبلہ کیسا؟ پس اللہ نے کہا کہ مشرق و مغرب سب جہات اللہ کی ہیں وہ جدھر حکم دے منہ پھیر لو۔^۱

اُمّتِ وسطیٰ

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى

النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ۚ (143:2)

اور اسی طرح ہم نے تمہیں ایک اُمّتِ وسطیٰ بنایا ہے تاکہ تم

گواہ ہو لوگوں پر اور رسول گواہ رہیں تم پر۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ جس طرح ہم نے تمہیں ایک افضل، عظیم اور مثالی قبلہ عطا کیا ہے، اسی طرح تمہیں بھی ایک اُمّتِ عادل اور مثالی قوم بنایا ہے تاکہ تم دنیا کی دوسری قوموں کے لیے اُسوۂ حسنہ بنے رہو اور حضور تمہارے لیے اُسوۂ حسنہ ہوں۔ حدیث میں بھی اُمّتِ وسطیٰ کے معنی اُمّتِ عادل کے لیے گئے ہیں عن ابی سعید الخدری عن النبی صلعم امة وسطا قال امة عدلا (عن احمد)۔

کُنْتُ عَلَيْهَا سے کیا مراد ہے؟

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتُ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ

الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ. (143:2)

اور جس قبلہ پر آپ اب تک تھے اُسے تو ہم نے اسی لیے کیا
تھا کہ پہچان لیں رسول کے متبعین کو، اُن کے پاؤں واپس چلے جانے والوں
سے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اگر روایات سے ثابت نہ ہوتا کہ حضور پہلے بیت المقدس کی طرف
منہ کر کے نماز پڑھتے رہے تو کہا جاسکتا تھا کہ کنت (تو تھا) صِرْتُ (تو ہوا ہے) کے معنی ہیں
آیا ہے، جس طرح اللہ کا ارشاد ہے كَانَ اللَّهُ عَزِيزًا حَكِيمًا اس میں صرف كَانَ ماضی کے
لیے نہیں اسی طرح اس آیت میں بھی کہا جاسکتا تھا کہ موجودہ قبلہ یعنی کعبہ کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ
اسے ہم نے اسی لیے قبلہ مقرر کیا کہ سچے اور جھوٹے امتیز ہو جائیں۔

ایمان ضائع نہیں ہوگا؟

وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّعَ إِيمَانَكُمْ. (143:2)

اور اللہ ایسا نہیں کہ ضائع ہو جانے دے تمہارے ایمان کو۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کا تعلق اہل کتاب میں سے اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو ایمان
لے آئے، اُنہیں کہا جا رہا ہے کہ ایمان لانے سے پہلے کی نمازیں جو اس قبلہ پڑھی گئی تھیں ضائع
نہیں ہوں گی۔ اُس شریعت میں قبلہ وہی تھا جو اب منسوخ ہو گیا۔

حکم کا انتظار

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ. (144:20)

بلاشبک ہم نے دیکھ لیا آپ کے منہ کا بار بار آسمان کی طرف

اُٹھنا۔

ابو مسلم کے نزدیک اگر روایات نہ ہوں تو آیت کے الفاظ سے اور معانی کا احتمال
ہے۔ یعنی حضور جب پہلے پہل مدینہ تشریف لائے تو رُخ کعبہ کی طرف پھیر لیا۔ کیونکہ مکہ میں تو
حضور ایسی جگہ نماز پڑھتے تھے کہ رُخ بیت المقدس کی طرف بھی رہتا اور کعبہ کی طرف بھی۔ مدینہ

میں آئے تو قبلہ کے متعلق حکم کا انتظار کرنے لگے۔ پس اللہ تعالیٰ نے حکم دیا:

قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ.

خدا کا بندوں کو یاد کرنا

فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ. (182:2)

مجھے یاد کرتے رہو میں تمہیں یاد کرتا رہوں گا۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ اللہ بندوں کو حکم دے رہا ہے ”تم مجھے اپنی دُعاؤں میں یاد کرو اور

میں ان کی قبولیت میں تمہیں یاد کروں گا۔“ جیسا کہ دوسری جگہ ہے:

اَذْعُوْنِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ.

یعنی تم مجھے پکارو میں تمہاری دُعا قبول کروں گا۔

پس اگر بندے اُسی پر بھروسہ کر کے، اُسی سے خائف ہو کر، اُسی کی محبت اپنے دل میں

بسا کر اور شرک کی نجاست سے پاک ہو کر اُسے پکاریں تو اللہ تعالیٰ اپنی ربوبیت کی شان کو حرکت

میں لائے گا۔

شہد ا کی زندگی

وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ

اَحْيَاءٌ وَلٰكِنْ لَا تَشْعُرُوْنَ. (154:2)

اور جو اللہ کی راہ میں ماریں جائیں انہیں مُردہ نہ کہو بلکہ وہ

زندہ ہیں البتہ تم ادراک نہیں کر سکتے۔

شانِ نزول میں تمام مفسرین کا متفقہ بیان ہے کہ غزوہ بدر میں جب کچھ صحابی شہید

ہو گئے تو منافقوں نے کہنا شروع کیا کہ انہوں نے خواہ مخواہ اپنی زندگی گنوا دی اور اس نعمتِ عظمیٰ

سے محروم ہو گئے۔ انہی کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی۔

شہد ا کی زندگی کے معاملے میں مفسرین مختلف الرائے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ عالم

برزخ میں انہیں طرح طرح کے لُذائِ ذل رہے ہیں اور ان کی زندگی رُوحانی زندگی ہے۔ کچھ لوگ

اس کے قائل ہیں کہ انہیں روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی زندگی حاصل ہے۔ لیکن ابو مسلم اصفہانی کو ان اقوال سے اختلاف ہے۔ اُن کی رائے یہ ہے کہ ”در اصل یہ آیت منافقین کے اس پروپیگنڈے کا جواب ہے کہ شہداءِ مفت میں زندگی جیسی نعمت سے محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وہ تمہاری طرح نہیں کہ تمہاری بعد کی زندگی بہت ہی ذلت آمیز موت سے بھی بدتر ہوگی۔ وہ تو زندہ کیے جائیں گے اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی عنایات سے سرفراز فرمائے گا۔ یعنی وہ ہمیشہ کے لیے مٹی میں نہیں مل گئے بلکہ وہ زندہ ہو کر اپنے رب سے انعام پائیں گے۔ ”اٰخِیَاء“ کے معنی زندہ ہونے والے کے ہیں۔ یہ اسم فاعل ”حی“ کی جمع ہے اور اس کے معانی حال اور استقبال دونوں طرح پر ہو سکتے ہیں۔ جیسے ”میت“ کا لفظ ہے کہ مردہ پر بھی بولا جاتا ہے اور آئندہ مرنے والے پر بھی۔ کتاب اللہ میں ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَاِنَّهُمْ مَيِّتُونَ۔

اے نبی! آپ بھی فوت ہونے والے ہیں اور یہ کفار بھی

مرنے والے ہیں۔

اسی طرح ”اٰخِیَاء“ کے معنی ”زندہ“ بھی ہو سکتے ہیں اور ”زندہ ہونے والے“ بھی۔ مؤخر الذکر معنی مراد لینے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی اور بھی کئی مثالیں قرآن میں موجود ہیں جو صاف حال کے لیے ہیں، لیکن کوئی بھی انہیں حال سے متعلق نہیں مانتا۔ بلکہ ہر مومن انہیں مستقبل پر قیاس کرتا ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ وَّاِنَّ الْفٰجَرٰۗۙ لَفِيْ جَحِيْمٍ۔

بلاشبہ نیک جنت میں ہیں اور بُرے دوزخ میں۔

ظاہر ہے ابرار اور فجار کا فیصلہ قیامت کے روز ہوگا اور پھر انہیں جنت اور دوزخ میں داخل کیا جائے گا۔

دوسری جگہ ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِی الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ۔

بے شک منافق دوزخ کے انتہائی عمیق حصے میں ہیں۔

قَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فِي جَنَّاتٍ النَّعِيمِ۔
پس جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اعمالِ صالحہ کیے وہ
جنت میں ہیں۔

ان تمام آیات میں جب یہی مفہوم لیا جاتا ہے کہ مستقبل میں ایسا ہوگا تو پھر شہدا کی
زندگی کے معاملہ میں کیوں ”آخِیاء“ جیسے واضح لفظ کو حال پر قیاس کیا جائے۔
کبھی بھی اس تفسیر میں ابو مسلم سے متفق ہیں۔ اصم نے یہ تاویل کی ہے کہ شہدا نام کی عمر
جیتے ہیں جیسے بقرط اپنے شاگردوں کو کہا کرتا تھا کہ جسم کے ساتھ مرد، لیکن روح کے ساتھ زندہ
جاوید ہو جاؤ۔

رہا یہ سوال کہ قیامت کے روز تو تمام مردے زندہ کیے جائیں گے، پھر شہدا کی کیا
خصوصیت تھی کہ ان کے متعلق اس عظمت اور شان کے ساتھ آیت اُتاری گئی۔ اس کا ایک الزامی
جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ ان کی روحانی اور جسمانی دونوں قسم کی زندگی کے قائل ہیں، ان
سے پوچھا جائے کہ شہدا اگر روح اور جسم کے ساتھ زندہ ہیں تو ان سے ہزار گنا بہتر زندگی انبیاء اور
صدیقین کو حاصل ہوگی، پھر شہدا کی زندگی میں کون سی خصوصیت تھی کہ اسے تو بیان کیا گیا مگر انبیاء
صدیقین صلیا اور اولیا کی زندگی کا کہیں تذکرہ نہ ہوا۔ جو لوگ صرف روحانی زندگی کے قائل ہیں ان
پر بھی اعتراض وارد ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کفار اور منافقین، شہدائے بدر کے متعلق جو کچھ مشہور کر
رہے تھے اللہ نے ان کے جواب میں یہ آیت نازل کی ہے۔ چونکہ موضوع یہی تھا اس لیے
دوسرے لوگوں کا ذکر نہ چھیڑا گیا۔

ابو مسلم نے آل عمران والی آیت سے بھی استدلال کیا ہے جس میں آخِیاء کے
ساتھ عَنْدَ رَبِّہُمْ کے الفاظ بھی آئے ہیں۔ ابو مسلم کا استدلال یہ ہے کہ ان کا اللہ کے نزدیک
زندہ ہونا اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ اس وقت کسی جگہ زندہ نہیں بلکہ جنت میں انہیں جگہ ملے گی
کیونکہ جنت میں قیامت سے پہلے کوئی داخل نہیں ہو سکتا۔

الْأَعْنُونَ کا صحیح مفہوم

يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَ يَلْعَنُوهُمُ اللَّعْنُونَ. (159:2)

اُن پر (کفار پر) اللہ اور لعنت کرنے والے لعنت کریں گے۔

مفسرین ”لاعنون“ میں جن، انس اور ملائکہ کو شامل سمجھتے ہیں اور اُن کی طرف سے لعنت کا مفہوم یہ لیتے ہیں کہ جن و انس اور ملائکہ اللہ سے درخواست کریں گے کہ انہیں فضل و کرم سے محروم کیا جائے بمعنی الدعاء علیہم بالایبعاد عن رحمة اللہ تعالیٰ (روح المعانی) لیکن ابو مسلم کو اس تفسیر سے اختلاف ہے۔ وہ لاعنون سے صرف مسلمان مراد لیتے ہیں اور لاعنون کے لعنت کرنے کے معاملہ میں بھی مفسرین سے اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں لعنت یہ ہے کہ مسلمان ان سے کسی قسم کا تعاون نہ کریں، پوری سختی سے اُن کی مخالفت کریں اور اُن سے بے زار ہو جائیں۔ مفسرین کی تفسیر پر انہیں یہ اعتراض ہے کہ جب اللہ خود اُن پر لعنت کرتا یعنی اپنی رحمت سے دُور کرتا ہے، تو پھر جن، انس اور ملائکہ کی یہ دُعا کہ اے اللہ انہیں رحمت سے دُور رکھ بے معنی نہیں تو اور کیا ہے؟

کفر پر مرنے والے

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ. (161:2)

جو لوگ کافر ہوئے اور کفر کی حالت میں ہی مر گئے۔

ابو مسلم کے نزدیک یہ وہی لوگ ہیں جو حق کو چھپاتے ہیں اور اسی حالت میں مر جاتے ہیں۔ تو اس زندگی کے بعد کی زندگی میں بھی وہ غضوب اور ملعون رہتے ہیں۔

تخلیق ارض و سموات

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ. (164:2)

بے شک تخلیق ارض و سموات میں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ کلام عرب میں خلق، تقدیر کے معنوں میں آتا ہے اور اسی لیے اس اسم کا اطلاق اللہ کے افعال پر ہوتا ہے، کیونکہ وہ تمام درست ہیں۔ ارشاد باری ہے خَلَقَ كُلَّ

مُشَىءٌ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا (اللہ نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اُس کے لیے قانون بنایا)۔ ہر امر محکم کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ تقدیر کے مطابق ہے۔

کتمانِ حق

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ. (2:174)

بے شک وہ لوگ جو اللہ کی نازل کی ہوئی چیز چھپاتے ہیں۔

اس امر میں اختلاف ہے کہ وہ کون سی چیز چھپاتے تھے۔ ابن عباس، قتادہ، سدی، ابو مسلم اور اصم کا خیال ہے کہ وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی طرف اشارہ ہے جو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق توریت اور انجیل میں بیان کی ہوئی پیش گوئیاں اور بشارتیں چھپاتے تھے۔

اختلاف فی الکتاب کا صحیح مفہوم

وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ

بَعِيدٍ. (2:172)

اور بے شک جو لوگ کتاب کے بارے میں اختلاف ڈال

رہے ہیں وہ بہت دُور دراز کے اختلاف میں پڑے ہوئے ہیں۔

ابو مسلم کا خیال ہے کہ اختلف بابِ افعال سے ہے جو فعل کے قائم مقام بھی استعمال

ہوتا ہے جیسے کسب اور اکتساب، عمل اور اعتما، کتب اور اکتتب۔ اس طرح آیت کے یہ معنی ہوں گے، جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف کیا تو یہ اکیلا ان کا اپنا فعل نہیں بلکہ یہ فعل پیچھے سے چلا آتا ہے اور گویا انہیں ورثہ میں ملا ہے۔ اختلاف میں یہی مفہوم پنہاں ہے کہ لوگ اسلاف کے نائب ہوئے۔ ایک اور جگہ ہے:

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ.

ان کے بعد ان کے نائب آئے۔

اسی طرح إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ یعنی ان میں سے رات دن ایک

دوسرے کے بعد آتے ہیں۔ یا جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ جَعَلَ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِمَنْ

أَرَادَ أَنْ يَذْكُرَ یعنی ان میں سے ایک دوسرے کے بعد آتا ہے۔

روزہ تے سے نہیں ٹوٹتا

وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ
مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ
(187:2)

اور کھاؤ اور پیو جب تک کہ تمہارے لیے صبح کا سفید خط سیاہ
خط سے نمایاں ہو جائے۔ پھر روزہ کو رات ہوتے تک پورا کرو۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ کھانا، پینا اور مباشرت کرنا بس یہ تین چیزیں ہیں جن سے روزہ
ٹوٹ جاتا ہے ان کے علاوہ کسی چیز سے نہیں ٹوٹتا۔ اور جن چیزوں کا فقہاء ذکر کرتے ہیں تو وہ خواہ
مخواہ کا تکلف ہے جیسے تے، حقنہ، اور ناک میں دوائی ڈالنا۔ ان میں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں
جس سے روزہ ٹوٹتا ہو، کیونکہ اصل میں تمام چیزیں مباح تھیں پھر اللہ تعالیٰ نے روزہ دار پر تین
چیزیں حرام کیں: کھانا، پینا اور مباشرت اور باقی جو کچھ رہ گیا وہ اپنی اصلی حلت میں ہے۔ پس ان
میں سے کسی چیز سے بھی روزہ نہیں ٹوٹتا۔

حدود اللہ

تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا. (187:2)

یہ اللہ کے ضابطے ہیں پس ان سے نکلنے کے قریب نہ جانا۔

ابو مسلم کے نزدیک مطلب یہ ہے کہ یہ حدود اللہ ہیں، پس ان میں تبدیلی کا یا ان کو
توڑنے کا خیال بھی نہ کرو:

فَلَا تَقْرُبُوا مَالَ الْيَتِيمِ.

پس مال یتیم کے قریب بھی نہ بھٹکو۔

آیات سے کیا مراد ہے؟

كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ. (187:2)

اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات بیان کرتا ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک آیات سے مراد مبینہ فرائض ہیں۔ جس طرح اللہ کا ارشاد ہے:

سُورَةُ اَنْزَلْنَاهَا وَفَرَضْنَاهَا وَاَنْزَلْنَا فِيهَا آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ.

پھر آیات کی تشریح تمام ایسے احکام سے کی ہے جو زنا کی حد وغیرہ کے متعلق ہیں۔ پس گویا اللہ نے فرمایا کہ لوگوں کے لیے شریعت کے فرائض بیان کیے گئے تاکہ وہ بُرائی سے بچیں اور احکام خداوندی کی پابندی کریں۔

اصل نیکی

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَى ۚ وَاَتُوا الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ. (189:2)

اور یہ تو کوئی نیکی نہیں کہ تم گھروں میں پچھوڑے کی طرف سے آؤ البتہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے۔ اور گھروں میں اُن کے دروازوں سے ہی آؤ اور اللہ سے تقویٰ اختیار کیے رہو تاکہ فلاح پا جاؤ۔

انصارِ مدینہ میں دورِ جاہلیت سے یہ رسم تھی کہ جب وہ حج یا عمرہ احرام باندھ لیتے تو اپنے اور آسمان کے درمیان کسی چیز کا حائل ہونا اُس وقت تک ناجائز سمجھتے جب تک احرام کھول نہ لیتے۔ اسی لیے جب وہ حج سے واپس آتے تو دروازوں سے نہ گزرتے کیونکہ اس طرح اُن کی مزعومہ نیکی ختم ہو جاتی۔ پس وہ دروازوں سے گزرنے کی بجائے پچھوڑے سے چھت پھاند کر آتے۔ اللہ نے حکم دیا کہ یہ کوئی نیکی نہیں اصل نیکی یہ ہے تقویٰ شعار بنو۔

فتنہ کے معنی

وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةً وَيَكُونَ الدِّينُ

لِلَّهِ. (193:2)

اور اُن سے جنگ کرو حتیٰ کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے

لیے خاص ہو جائے۔

ابو مسلم کے نزدیک یہاں فتنہ سے آزمائش مراد نہیں بلکہ یہاں یہ لفظ حُرْم اور ظلم کے

معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

حج اور عمرہ

وَأَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلَّهِ. (196:2)

اور حج اور عمرہ پورا کرو اللہ کے لیے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حج کا یا عمرہ کا قصد کریں تو لازماً وہ

اسے پورا کریں۔ اس تاویل کی صحت پر یہ بات دلالت کرتی ہے کہ یہ آیت اُس وقت نازل ہوئی

جب کفار مکہ نے نبی اکرم کو حج اور عمرہ سے روکا تھا۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ

جب اس کام کا ارادہ کر لیا جائے تو اسے انجام تک پہنچایا جائے، مجبوری الگ چیز ہے۔ یہیں سے

یہ فقہی مسئلہ بھی نکلتا ہے کہ نفلی حج اور عمرہ کا جب قصد ہو جائے اور آدی نکل کھڑا ہو تو اُن کو بھی فرضی

حج کی طرح پورا کرنا واجب ہے۔

عِقَاب کا مفہوم

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ. (196:2)

اور اچھی طرح جان لو کہ اللہ شدید العقاب ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک عِقَاب عاقبت سے مشتق ہے اور اس کے معنی ہیں بُرے کام کا انجام۔

حج کے بعد تجارت کی اجازت

وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ

رَبِّكُمْ. (198:2)

اس میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنے رب کے ہاں تلاش معاش

کرو۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ تم حج کے تمام افعال احکام الہی کے مطابق انجام دو، اس کے بعد کوئی مضائقہ نہیں کہ تم رزق تلاش کرو۔ اس کی نظیر سورہ جمعہ کی آیت ہے:

وَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلَاةُ فَانْتَشِرُوا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوا مِنْ فَضْلِ اللَّهِ.

اور نماز پوری کر لو تو زمین میں بکھر جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو یعنی نماز کے بعد اپنی روزی کی تلاش میں نکل جاؤ۔

كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ سے مراد

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا. (200:2)

پس یاد کرو اللہ کو اپنے آباؤ اجداد کی طرح بلکہ یہ یاد اس سے بھی بڑھ کر ہو۔

ابو مسلم کا خیال ہے کہ والدین کی یاد بطور مثال پیش کی گئی ہے کہ جس طرح والدین کی یاد دوائی ہوتی ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی بہت زیادہ اللہ کی یاد ہونی چاہیے تمہیں ہر وقت اسی کا خیال ہونا چاہیے۔

شیطان کی دشمنی

إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ. (208:2)

بے شک وہ (شیطان) تمہارا کھلا دشمن ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک مبین صفاتِ بلیغہ میں سے ہے جیسے حَسَمٌ وَالْكِتَابُ الْمُبِينُ۔ یہ دنیا آزمائش گاہ ہے اور اس میں ہر آدمی کو اختیار ہے کہ نیکی اور بدی کی راہوں میں سے جس راہ پر چاہے چلے، اس دنیاوی زندگی تک تو ہمارے اختیارات ہیں مگر اگلی دنیا میں تمام اختیارات خدا کے ہوں گے، پس انسان کو چاہیے کہ وہ ہر کام میں خدا کی رضا کو مد نظر رکھے اور شیطان سے بچنے کی کوشش کرے۔

زَيْنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا. (212:2)

دنیا کی زندگی کفار کی نظر میں خوش نما کر دی گئی ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک آیت میں اس کا احتمال بھی ہے کہ یہ زینت خدا کی طرف سے نہیں بلکہ خود انہیں کے نفس نے دی۔ اور فصحاء عرب اُس شخص کے لیے جو ان سے دُور ہو جائے کہتے ہیں کہ ایسا ذہب بک۔ اور مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کوئی لے جانے والا اسے لے گیا بلکہ وہ خود دُور ہوتا ہے۔ یہی مضمون اکثر آیات میں آیا ہے اَنّٰی يُؤَفِّكُوْنَ۔ اَنّٰی يُصْرَفُوْنَ۔ شیطان کی بھی یہ طاقت نہیں کہ وہ کوئی کام انسان سے جبراً کرائے۔ پس یہ انسان ہی ہے جو اپنے نفس کے دھوکے میں آ کر اسی زندگی کو حسین سمجھتا ہے جو وہ بسر کر رہا ہے۔

أُمَّةً وَاحِدَةً

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً. (113:2)

لوگ ایک ہی اُمت تھے۔

ابو مسلم اور قاضی جبائی کا قول ہے کہ لوگ اپنی عقل کو راہ نمایا کر اُمتِ واحدہ کی حیثیت رکھتے تھے اور دراصل یہ اللہ اور اس کی صفات کا اعتراف تھا۔ اُس کے احسانات کا شکر ادا کرنے، اُس کی عبادت میں کوشاں رہنے، بُرائی سے بچنے، ظلم، جھوٹ اور جہالت جیسی چیزوں سے اجتناب کرنے میں یہی راز تھا کہ عقلی لحاظ سے ساری نسلِ انسانی ایک طرح سے سوچتی تھی۔ اس کے بعد یہ الفاظ ہیں فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ (پس اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا)۔ یہاں ف کا حرف تراخی کے لیے ہے۔ پس اس آیت سے ثابت ہے کہ نسلِ انسانی پہلے موجود تھی اور بعد میں انبیاء کی بعثت شروع ہوئی۔ اور تمام شریعتوں سے پہلے نسلِ انسانی کی وحدت موجود تھی بعد میں اختلافات رونما ہوئے۔

پس ظاہر ہے کہ نسلِ انسانی ابتدا میں ایک اُمتِ واحدہ تھی ”کَانُوا عَلَى شَرِيعَةٍ مِنَ الْحَقِّ“ (ابن جریر عن ابن عباسؓ)۔ ”کَانُوا عَلَى الْهَدٰی جَمِیْعًا“ (ابن جریر عن قتادہ)۔

جیسا کہ بیان کیا گیا، تراخی کے لیے آئی ہے، یعنی اس حالت کے بہت عرصہ بعد جب اختلافات پیدا ہو گئے اور نسل انسانی متفرق ہو گئی تو ان بکھرے دانوں کو پھر ایک وحدت میں پرونے کے لیے انبیاء کا سلسلہ جاری ہوا۔ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے تو حضرت آدم پیدا ہوئے جو خود نبی تھے، پس یہ کیوں کر تسلیم کیا جائے کہ پہلے انسان موجود تھے بعد میں انبیاء پیدا ہوئے، تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ انسانِ اوّل یعنی آدم علیہ السلام مع اپنی اولاد کے پہلے پہل عقلی شریعت سے استفادہ کرتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بہت عرصہ بعد انہیں نبوت سے سرفراز فرمایا اور اپنی اولاد کی طرف مبعوث کیا۔

حرمات کے مہینے

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ. (217:2)

اور آپ سے حرمت والے مہینوں میں قتال کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ فرما دیجیے کہ ان میں قتال بہت سخت گناہ ہے اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا اور مسجد حرام۔
فراء اور ابو مسلم کے نزدیک مسجد حرام کا عطف شہر حرام پر ہے اور اس کی ترتیب یوں ہے:

يسئلونك عن قتال في شهر الحرام والمسجد الحرام.
یعنی تجھ سے حرمت کے مہینوں اور مسجد حرام میں قتال کے متعلق پوچھتے ہیں۔

اس کے بعد دو طریقے ہوں سکتے ہیں یا تو قتال فیہ مبتدا ہے اور کبیر، وصد عن سبیل اللہ اور کفر بہ متواتر خبر ہیں۔ پھر مفہوم یہ ہوگا کہ ایسا قتال گناہ کبیرہ ہے، اللہ کی راہ سے روکنا ہے اور اللہ کے ساتھ کفر ہے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ”قتال فیہ کبیر“ کو مبتدا اور خبر مانا جائے اور صد عن

سبیل اللہ مبتدا کے ساتھ مرفوع تسلیم کیا جائے اور اسی طریقہ سے کفر بہ اور خبر محذوف مقدم پھر دلالت کے لیے ہے۔ اور اس کی ترتیب یوں ہے کہ:

قتال^۱ فیہ وصد عن سبیل اللہ وکفر بہ کبیر۔
 کہ اس میں قتال اور اللہ کی راہ سے روکنا اور اس کا انکار کرنا (یعنی اس حکم کا) کبیرہ گناہ ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصد عن سے لے کر اکْبُرُ عِنْدَ اللّٰهِ تک ایک ہی آیت تسلیم کی جائے، پھر معافی یوں ہوں گے:

”شہر حرام میں قتال بڑا گناہ ہے مگر اس سے کہیں بڑے گناہ یہ ہیں اللہ کی راہ سے روکنا، اس کا انکار کرنا، مسجد حرام سے روکنا اور اُس سے رہنے والوں کا نکالنا۔“

إِنْفَاقٌ فِی سَبِيلِ اللّٰهِ

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ قُلِ الْغَفُورُ (2:219)

آپ سے پوچھتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں؟ کہہ دیجیے کہ جو ضرورت سے زیادہ ہو۔

ابو مسلم کے نزدیک غفو سے مراد زکوٰۃ ہے۔ یہاں اس کا اجمالی ذکر ہے اور اس کی تفصیل سنت میں مذکور ہیں۔

تُخَالِطُوهُمْ كَمَعْنٰی

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامٰی قُلْ اِصْلَاحٌ لَهُمْ خَيْرٌ وَّ اِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۝
 (220:2)

اور آپ سے یتیموں کے متعلق دریافت کرتے ہیں فرمادیجیے کہ اُن کی مصلحت کی رعایت رکھنا بہتر ہے اور اگر تم اُن کے ساتھ شامل

ہو جاؤ تو وہ تمہارے بھائی ہیں اللہ کو علم ہے کہ مفسد کون ہے اور مصلح کون۔
ابو مسلم کے نزدیک غلط سے مراد نکاح میں قربت ہے جس طرح دوسری آیت میں ہے:

وَأَنْ خِفْتُمْ أَنْ لَا تَقْسِطُوا فِي الْبَتَامَىٰ فَانْكِحُوا.

ایک اور آیت میں ہے:

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَاءِ قُلِ اللَّهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ وَمَا

يُنْزِلُ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتَابِ فِي يَتَامَى النِّسَاءِ.

مذکرہ آیات اور اس آیت میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں یتیم لڑکیوں کا ذکر ہے اور اس میں یتیم لڑکوں کا۔ اور اس آیت میں بعض لوگوں نے غلط سے مراد شرکت فی المال لی ہے لیکن یہ غلط ہے، کیونکہ غلط کا مفہوم ذاتی طور پر یتیم سے شرکت ہے اور مالی شرکت کے لیے غلط نہیں شرکت کا لفظ موزوں تھا۔

مشرک عورتوں سے نکاح

وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكَاتِ حَتَّىٰ يُؤْمِنَ. (221:2)

اور مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لے

آئیں۔

ابو مسلم کے نزدیک یہ یتیموں والی آیت سے مربوط ہے اس لیے اس پر عطف آیا ہے۔ اس آیت میں آگے چل کر بیان کیا کہ مشرک مردوں سے نکاح بھی ممنوع ہے چاہے وہ کتنے ہی دولت مند کیوں نہ ہوں۔ تو ان آیات میں یتیم لڑکوں کو اپنی بیٹیاں نکاح میں دینے کی ترغیب ہے۔

توبہ کا مفہوم

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ. (222:2)

بے شک اللہ توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ لغت میں توبہ کے معنی لوٹنے کے ہیں اور بندے کا اللہ کی طرف لوٹنا

ہر حالت میں اچھا ہے۔

اللہ کو قسموں کا نشانہ نہ بناؤ

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ. (224:2)

اور اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔

امام رازی کہتے ہیں کہ اس آیت کے متعلق ابو مسلم کا قول سب سے اچھا ہے کہ اس میں لوگوں کو بار بار اللہ کی قسم کھانے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا بار بار ذکر کرنا ایسا ہوتا ہے جیسے اسے نشانہ بنا دیا گیا۔ جیسے کہا جاتا ہے:

قد جعلتني عرضة للوهمك .

تو نے مجھے اپنی ملامتوں کا نشانہ بنا لیا ہے۔

ایک شاعر کا قول ہے

ولا تجعلني عرضة للوانم

مجھے اپنی ملامتوں کا نشانہ نہ بناؤ۔

اسی طرح اللہ نے بھی بار بار قسم کھانے سے منع فرمایا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

وَلَا تَطْغَوْا كُلَّ حَلَالٍ مَّهِينٍ.

زیادہ قسمیں کھانے والوں کی اطاعت نہ کرو۔

ایک اور جگہ ہے:

وَاحْفَظُوا أَيْمَانَكُمْ.

قسموں کی حفاظت کرو۔

اور عرب کسی کی مدح کرتے تو یہ بھی ایک صفت شمار کی جاتی کہ وہ بہت کم قسمیں کھاتا

ہے۔ کما قال کثیر :

قليل الألباء حافظ ليمينه

وإن سبقت منه الأليه برت

”اس میں غصہ کی تلخی کم ہے وہ قسموں کی حفاظت کرتا ہے یعنی کم قسمیں کھاتا ہے اور اگر اُس سے کوئی خطا سرزد ہوتی ہے تو اس سے برأت کا اظہار کرتا ہے۔“

اور اس حکم کی ایک اور علت یہ ہے کہ جو آدمی ہر چھوٹی بڑی بات پر قسم کھاتا ہے اُس کی زبان چلے لگتی ہے اور اُس کے دل میں قسم کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ چھوٹی قسموں میں اُس سے اعتبار اٹھ جاتا ہے تو بڑی قسموں میں بھی اُسے معتبر نہیں سمجھا جاسکتا۔ اس کے بعد ہے اَنْ تَبْسُرُوْا بِهٖ اِلٰفَاظُ اُی حکم کی علت ظاہر کرتے ہیں کہ جب اللہ کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ گے تو تقویٰ کی صفت فروغ پائے گی۔ کیونکہ دل میں یہ خیال پیدا ہوگا کہ اللہ کی ذات بہت ارفع و اعلیٰ ہے اور دنیا کی گھٹیا چیزوں میں اس کا نام لینا مناسب نہیں تو ایسے شخص میں تقویٰ کی صفات بڑھیں گی اور لوگوں کو اس پر اعتماد ہوگا اور وہ اپنے اس اعتماد کی بدولت لوگوں کی اصلاح کر سکے گا اور اُن کے جھگڑوں کو مٹا کر صلح کرائے گا۔

مطلقہ عورت پہلے خاوند سے کس نکاح کر سکتی ہے

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْ بَعْدِ حَتٰی تَنْكِحَ زَوْجًا

غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا اَنْ يَّبْتَزَّاجَعَا . (230:2)

پھر اگر کوئی اپنی عورت کو طلاق دے تو وہ عورت اُس کے لیے اس کے بعد جائز نہ رہے گی حتیٰ کہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے پھر اگر وہ بھی اسے طلاق دے دے تو دونوں کے لیے کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر مل جائیں۔

اسی آیت سے بعض حضرات نے حلالہ کی رسم ایجاد کر لی، کہ اگر کوئی طلاق دے کر پشیمان ہوتا ہے تو ایک رات کے لیے کسی اور سے نکاح کر دیتے ہیں پھر وہ طلاق دے دیتا ہے اور تب عورت کا اپنے پہلے خاوند سے نکاح کر دیا جاتا ہے۔ فاروق اعظمؓ نے اس حیلہ کو زنا کا مترادف قرار دیا ہے۔

حَتٰی تَنْكِحَ سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ دوسرے خاوند سے صرف نکاح ہی کافی ہے یا

خلوت صحیح بھی ہونی چاہیے؟ مفسرین متفق ہیں کہ خلوت صحیح ضروری ہے۔ اختلاف اس امر میں ہے کہ یہ چیز قرآن سے ثابت ہے یا حدیث سے۔ امام ابن جریر لکھتے ہیں الدلالة على ذلك اجماع الامة جميعا (اس پر دلیل اجماع امت ہے)۔ لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ شرط قرآن حکیم سے ہی ثابت ہے کیونکہ نکاح کا لفظ جب مطلق صورت میں آئے تو اس سے مراد عقد زوجیت ہے لیکن جب اضافت زوجة و امرأة کے ساتھ ہوگی تو ہم بستی مراد ہوگی۔ اور یہی جمہور مجتہدین کا مذہب ہے۔ اختلاف صرف سعید بن جبیر اور سعید بن المسیب سے منقول ہے لیکن مذہب جمہور نہایت قوی اور قرآن کے عین مطابق ہے۔

امام رازی نے ابو مسلم کا قول نقل کر کے لکھا ہے:

هذا هو المختار.

قول مختار یہی ہے۔

وارث کی ذمہ داری

لَا تُصَارُّ وَالِدَةٌ بَوْلِدَهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بَوْلِدِهِ مَرَّ عَلَى
الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ ۝ (233:2)

نہ کسی ماں کو تکلیف پہنچائی جائے اس کے بچے کے باعث، نہ

کسی باپ کو اس کے بچے کے باعث اور یہی وارث کے ذمہ بھی ہے۔

ابن عباسؓ کے نزدیک وارث سے مراد باپ کا وارث ہے۔ ابو مسلم کے نزدیک یہ قول

ضعیف ہے۔ کیونکہ اس سے اگر باپ کا وارث مراد لیا جائے تو اس کا بیٹا بھی وارث ہوتا ہے تو نفقہ کا وجوب مال کی موجودگی میں دوسرے پر لازم آتا ہے اور یہ جائز نہیں۔

اصل یہ ہے کہ اگر بچہ مال کا مالک نہ ہو تو اس کے مال وار عزیزوں میں سے جو اس

کے محرم ہوں اور محرم ہونے کے علاوہ شرعاً اس کے مستحق میراث بھی ہیں، پس ایسے محروم وراثت

قربت داروں کے ذمہ اس کا خرچ واجب ہوگا۔ یہ قول حسن، قنواہ، قاضی اور ابو مسلم کا ہے۔ اسی

سے فقہائے حنفیہ و حنبلیہ نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ محتاجوں اور نابالغوں کے مصارف ان کے اقارب

کے ذمہ ہیں۔ فاروق اعظمؓ کا بھی یہی قول ہے:

من ذهب من الحنفية والحنبلية الى وجوب نفقة
الاقارب بعضهم وهو مروى عن عمر بن الخطاب و
جمهور السلف (ابن كثير)

بچے کا دودھ چھڑانا

فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْهِمَا (233:2)

پھر اگر دونوں باہمی رضا مندی اور مشورہ سے دودھ چھڑانا
چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک فصال سے ماں بیٹے کی علیحدگی مراد ہے اور اس کے لیے ضروری
ہے کہ باپ ماں سے مشورہ لے تا کہ بچے کا ضرر مقصود نہ ہو، گویا باہمی مشورہ سے مدت رضاعت
سے کم میں بھی دودھ چھڑایا جاسکتا ہے۔

مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ كَاصْحَحٍ مُطْلَب

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ
تَمْسُوهُنَّ. (236:2)

اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم اُن بیویوں کو طلاق دو جنہیں تم نے
ہاتھ نہیں لگایا۔

ابو مسلم کا خیال ہے کہ مَس سے مراد جماع ہے لیکن اللہ نے حدودِ اخلاق کو ملحوظ رکھتے
ہوئے احسن الفاظ میں اشارۃً بیان فرمایا ہے۔

محسن مومن کو کہتے ہیں

حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ (236:2)

واجب ہے محسنین پر۔

ابو مسلم کے نزدیک اس سے مراد یہ ہے کہ جو کوئی محسن بننا چاہے تو اُس کی یہ شان اور

یہ طریقہ ہے۔ اور محسن مومن ہی ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ جس عمل کا ذکر کیا گیا ہے وہ مومنین کا طریقہ ہے۔

بَلِّغْ الرُّسُلَ كَمَا بَعَثْتَهُمْ

بَلِّغْ الرُّسُلَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (253:2)
ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت دے رکھی

ہے۔

دوسرے پارہ کی آخری آیت یہ تھی:

بَلِّغْ آیَاتِ اللَّهِ تَلَوْنَهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَإِنَّكَ
لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ.

ابو مسلم نے ان دونوں آیتوں میں یہ ربط بیان کیا ہے۔ پہلے اللہ نے سرور کائنات کو بچھلے انبیاء اور ان کی قوموں کے متعلق بتایا جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا سوال بتایا کہ وہ کہتے تھے ”اے اللہ ہم کو کسی شکل میں دیدار کراوے“ یا موسیٰ علیہ السلام سے اُن کی یہ درخواست کہ وہ کہتے تھے ”اے موسیٰ! ہمارے لیے بھی کوئی بت مقرر کر دے“ یا جیسا عیسیٰ علیہ السلام کی قوم کا طرزِ عمل کو جب انہوں نے دیکھا کہ عیسیٰ مُرد کو زندہ کرتے ہیں اور جذامیوں کو صحت یاب کرتے ہیں تو انہوں نے آپ کو جھٹلایا اور آپ کے قتل کے درپے ہوئے اور بعض یہودیوں نے آپ پر کفر کا فتویٰ صادر کیا اور ایک فریق نے آپ کی دوستی کا دعویٰ کیا اور یہود سے آپ کے مصلوب ہونے کا بدلہ لینے کا مطالبہ کیا اور بنی اسرائیل کے سرداروں کا حال بیان ہوا جنہوں نے حضرت طالوت سے حسد کیا اور اُن کی بادشاہی کے منکر ہو گئے اور اللہ نے حضرت طالوت کو کامیابی عطا فرمائی۔ اس آیت میں بیان فرمایا کہ کچھ وہ پیغمبر بھی گزرے ہیں جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا اور باقی انبیاء کو بلند درجات عطا فرمائے۔ ان کی قوموں نے معجزات دیکھنے کے بعد بھی انبیاء کے ساتھ وہی سلوک کیا جو آج رسولِ عربی سے ہو رہا ہے۔ پس گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ حضور کو اپنی قوم کے طرزِ عمل سے مغموم نہیں ہونا چاہیے کیونکہ نور اور ظلمت اور حق اور باطل میں ازل سے جنگ چلی آتی ہے۔

وَاَيَّدَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ (253:2)

اور ہم نے عیسیٰ کی تائید روح القدس سے کی۔

ابو مسلم کے نزدیک جائز ہے کہ اس سے وہ پاکیزہ روح مراد لی جائے جو اللہ نے اُن میں پھونکی تھی (یعنی خود عیسیٰ علیہ السلام کی روح) جس کے ساتھ اللہ نے دوسروں سے امتیاز کر دیا جو مرد و عورت کے ملاپ سے پیدا ہوئے تھے۔

اللہ کی ذات زمان و مکان کی قید سے پاک ہے

لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (255:2)

اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔

لَسُو کو مقدم کرنے سے معنوں میں زور اور تاکید پیدا کرنا مقصود تھا، اس لیے حصر کا مفہوم آگیا کہ ساری کائنات کی ملکیت اور مالکیت صرف اُسی کی ہے۔ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ مکان اللہ کی ملکیت ہے۔ دوسری جگہ ارشاد باری ہے:

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ.

اور یہ آیت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ زمان بھی اُسی کی ملکیت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس سے بہت بلند اور پاک ہے کہ کسی مکان سے اُس کی بزرگی بیان کی جائے، یہ اللہ کی عظمت اور شان کے منافی ہے کہ اُسے کسی جہت اور مکان سے مقید مانا جائے یا اُس کی مقدار یا حجم بیان کیا جائے (نعوذ باللہ)۔ ابو مسلم کے یہ اقوال نقل کرتے ہوئے بے ساختہ امام رازی کہہ اٹھتے ہیں:

وَمَا احسن ما قال ابو مسلم بن بحر الاصفهاني.

کری

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (255:2)

اُس کا علم زمین و آسمان کو محیط ہے۔

کری سے مراد علم ہے کیونکہ علم امر معتمد علیہ کو کہتے ہیں اور کری بھی معتمد علیہ ہے اور

لغت میں بھی کرسی سے مراد علم ہے۔ علما کو کرا سی بھی کہتے ہیں اور اوتا دالارض بھی۔

جبر و قدر

لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ (2:256)

دین میں کوئی جبر نہیں۔

ابو مسلم اور قتال کا قول معتزلہ کے اصولوں کی وضاحت کرتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے ایمان کی بنیاد جبر پر نہیں بلکہ اپنے اختیار پر رکھی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے توحید کے دلائل واضح طور پر بیان کر دیے اور کسی عذر کی گنجائش نہ چھوڑی تو اس کی ضرورت باقی نہ رہی کہ کفار کو ایمان لانے پر مجبور کیا جائے۔ حق اور ضلالت کی راہیں واضح ہو چکیں، اب ہر ایک کو اختیار ہے کہ چاہے تو حق کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو ضلالت کی تاریک راہوں پر بھٹکتا رہے۔

فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ.

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَأَمَنَّ مَنْ فِي الْأَرْضِ كُلَّهُمْ جَمِيعًا

أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ

اگر تیرا رب چاہتا تو تمام لوگ مسلمان ہو جاتے، کیا تو لوگوں

کو مجبور کرے گا کہ وہ مومن ہو جائیں۔

آیت لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ کے معا بعد قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (حق

ضلالت سے میسر ہو چکا) کی آیت آتی ہے جو اس مفہوم کی تائید کرتی ہے کہ اللہ کسی کو ایک خاص راہ پر چلانے کے لیے مجبور نہیں کرتا۔ وہ تو محض صداقت اور بطلت کی راہیں دکھا دیتا ہے۔

ابراہیمؑ اور چار پرندے

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُنحِي الْمَوْتَى قَالَ

أَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ؕ قَالَ فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ

الطَّيْرِ فَصَرُ هُنَّ اِلَيْكَ تُمْ اَجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ
ادْعُهُنَّ يَاتِيَنَّكَ سَعِيًا ط (260:2)

اور جس وقت ابراہیم نے عرض کی اے میرے پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو سرِ دوں کو کس طرح جلائے گا۔ ارشاد ہوا کیا تمہیں یقین نہیں عرض کی ضرور ہے لیکن یہ درخواست اس لیے ہے کہ قلب کو اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ ارشاد ہوا کہ چار پرندے لو پھر انہیں اپنے سے ہلا لو پھر ان میں سے ایک ایک جزو کو پہاڑ پر رکھ دو پھر ان کو اپنی طرف بلاؤ تو وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے۔

جمہور مفسرین اس چیز کے قائل ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم دیا گیا تھا کہ چار پرندے لے کر انہیں ذبح کریں پھر ان کا گوشت آپس میں ملا کر پہاڑوں پر رکھ دیں اور پھر انہیں پکاریں تو زندہ ہو کر آ جائیں گے۔ لیکن ابو مسلم اصفہانی کی رائے ان کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں: ”ابراہیم علیہ السلام نے سرِ دوں کو دوبارہ زندہ کرنے کے متعلق سوال کیا ہے اگر پرندوں کو مار کر زندہ کرنا ہی مقصود ہوتا تو ایک پرندہ کو مار کر زندہ کر دینا کافی تھا، چار کو لے کر انہیں ذبح کرنے اور پھر گوشت کے اجزا باہم ملا دینے کی کیا ضرورت تھی“۔ اصل میں صُرُّهُنَّ اِلَيْكَ کے معنی ہلانے اور سکھانے کے ہیں۔ اب مفہوم یہ ہوا کہ ابراہیم چاروں پرندوں کو ہلا لیں اور پھر ان میں سے ہر ایک کو قریب کے پہاڑوں پر چھوڑ دیں پھر ان کو بلائیں تو وہ بھاگتے آئیں گے۔ اور اس محسوس مثال کے ذکر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس طرح اللہ تعالیٰ کے بلانے پر روحیں دوڑتی آئیں گی۔ اس تفسیر کی ابو مسلم نے چند وجوہات بیان کی ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے صُرُّهُنَّ کے معنی ہلانے اور سکھانے کے ہیں۔ علاوہ ازیں آیت میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جس سے ذبح کرنے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا مفہوم لیا جاسکے۔ اپنے طرف سے کچھ الفاظ داخل کرنا جن کا کوئی قرینہ بھی نہ ہو قطعاً ناجائز ہے۔

دوسرے اگر صُرُّهُنَّ کی شاذ قرأت صُرُّهُنَّ بھی مان لی جائے، اور اس کا مفہوم قطع کرنا لیا جائے تو اِلَيْكَ کے کیا معنی ہوں گے، ظاہر ہے کہ اِلَيْكَ یہاں قطعاً بے معنی

ہوتا اور آیت بھی یوں ہوتی فَخُذْ أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ حق یہ ہے کہ صُرْهُنَّ کا مفہوم ہلانا ہے اور جب اِلٰہی بھی اس کے ساتھ آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنا مفہوم واضح کر دیا۔ کیا کوئی یہ دکھا سکتا ہے کہ صُرْهُنَّ کے ساتھ اِلٰہی کا صلہ آئے اور پھر اس کا مفہوم کاٹنا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ اُذْعُهُنَّ صاف پرندوں کی طرف راجع ہے۔ ظاہر ہے کہ پرندے زندہ ہوں گے، کیونکہ اگر گوشت کے ٹکڑوں کو ہلانا مقصود ہوتا تو ضمیر انہیں کی طرف راجع ہوتی۔ اگر بعض اجزا بھاگ کر بعض کے پاس آتے تو يَأْتِيَنَّكَ کی ضمیر اجزا کی طرف ہوتی۔ مگر وہ پرندوں کی طرف ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر ”جُزْءُ ۱“ کا لفظ نہیں آنا چاہیے تھا، تو یہ بھی کوئی وقع سوال نہیں۔ کیونکہ جُزْءُ ۱ کی ضمیر اضافت چاروں کی طرف کی ہے اس لیے ضروری ہے کہ جُزْءُ اسے مراد ان چاروں میں سے ایک پرندہ ہو۔

الحكمة

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا. (269:2)

اور جسے حکمت عطا ہوگئی اُسے یقیناً خیر کثیر عطا ہوگئی۔

ابو مسلم کے نزدیک حکمت حکم سے فعل ہے جیسے نخلة نخل سے ہے۔ ایک آدمی حکیم اس وقت کہلاتا ہے جب انتہا درجے کا عقل مند ہو۔ اور اصابتِ رائے اور سلامتی فکر رکھتا ہو۔ یہاں یہ لفظ (حکیم) فاعل کے معنوں میں استعمال ہو رہا ہے۔ اور یہی حکیم بروزن فاعیل مفعول کے معنوں میں بھی آتا ہے جیسے اَمْرٌ حَكِيمٌ اَمْرٌ تحکم کے معنوں میں آتا ہے۔

حواشی

۱ مصر ایک ملک کا نام ہے نہ کہ کسی شہر کا۔ (مترجم)

۲ بات صاف نہیں ہوئی۔ (مترجم)

سورۃ آل عمران

بالحق سے مراد

نَزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ. (3:3)

اللہ تعالیٰ نے آپ پر حق کے ساتھ کتاب نازل کی۔

ابو مسلم کے نزدیک بالحق سے بہت سی وجوہات کا احتمال ہے (اولاً) اس میں گزشتہ امتوں کے جو حالات مذکور ہیں وہ تمام صحیح ہیں (ثانیاً) اس میں جو ترغیب و ترہیب اور وعد و وعید ہیں وہ مکلف کو حق کے رستے پر چلنے کے لیے آمادہ کرتے ہیں۔ (ثالثاً) کتاب اللہ حق ہے، قول فصیل ہے اور ہزل گوئی نہیں۔

قرآن پہلی کتابوں کا مصدق ہے

مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ. (3:3)

قرآن اُن کتابوں کی تصدیق کرنے والا ہے جو اس سے پہلے

آچکی ہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ تمام انبیاء دنیا میں حق و صداقت کی دعوت دیتے آئے تھے اور عدل و احسان، توحید اور ایمان کی تلقین کرتے رہے، قرآن اُن تمام کی تصدیق کرتا ہے۔

محکمات و متشابہات

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُّحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ ۖ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ ۗ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا

بِهِ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ (6:3)

وہی خدا ہے جس نے آپ پر کتاب اُتاری ہے، اس میں محکم آیتیں ہیں اور وہی کتاب کا اصل مدار ہیں اور دوسری آیتیں مشابہ ہیں۔ سو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے، وہ اس کے مشابہ حصے کے پیچھے ہو لیتے ہیں شورش کی تلاش میں، اور اس کے (غلط) مطلب کی تلاش میں۔ حالانکہ اس کا صحیح مطلب کوئی نہیں جانتا۔ بجز اللہ کے اور پختہ علم والے کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان لائے یہ سب اللہ کی طرف سے ہیں۔

ابو مسلم فرماتے ہیں الزیغ ول کی وہ کجی ہے جس کے باعث فتنہ پسند لوگ مشابہات کے پیچھے ہو لیتے ہیں اور محکمات کے مطابق اُن کی تاویل نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر ”وَإِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُوا فِيهَا“ اس آیت سے وہ یہ مطلب نکالتے ہیں کہ اللہ خود ہی کسی بستی کو بلا وجہ تباہ کر دیتا ہے اور مترفین خود خدا کے حکم سے گم راہ ہوتے ہیں۔ یہ اور ایسی بہت سی آیات ہیں جن کا صحیح مفہوم اُسی وقت ظاہر ہوتا ہے جب دوسری آیات کو سامنے رکھا جائے۔ اسی آیت کو لیجیے، اس کے ساتھ اگر زانغین ”إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ، وَمَا كُنَّا مُهْلِكِيكَ الْقُرَى“ وغیرہ کو بھی سامنے رکھ لیتے تو مطلب صاف تھا، مگر دلوں کی کجی ہے جو آنکھوں کو اندھا کر دیتی ہے اور صاف جبر کی قائل ہو جاتے ہیں۔ پس ایسی آیات مشابہات ہیں جن کا صحیح مطلب دوسری آیات پر مدار رکھتا ہو اور یہ چیز راسخون فی العلم کو حاصل ہے۔

دعا

رَبَّنَا لَا تُرِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا. (7:3)

اے پروردگار سیدھی راہ دکھانے کے بعد ہمارے دلوں کو کج

نہ کر۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ دلوں کو ٹیڑھا نہیں کرتا پس یہ تو محض ایک دعا ہے جس کے معنی ہیں، اے ہمارے پروردگار ہمیں یہ توفیق عطا فرما کہ نفس کے فریب سے بچیں تاکہ دلوں

میں کوئی کجی پیدا نہ ہو جائے۔

خیل مسومہ

زَيْنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ
وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ
وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْبِ ؕ (13:3)

لوگوں کے لیے خوش نما کر دینی گئی ہے مرغوبات کی محبت خواہ
عورتوں سے ہو یا بیٹوں سے یا ذہیر لگے سونے اور چاندی سے یا نشانی
پڑے گھوڑوں سے یا مویشیوں سے یا زراعت سے۔

ابو مسلم کے نزدیک مسومہ السیماء سے ماخوذ ہے اور السیماء کے ساتھ بھی ہے
اور دونوں کے معنی ایک ہیں اور یہ سن و جمال کا نشان ہے۔ کتاب اللہ میں سِمْأَهُمْ فِي
بُجُوهِهِمْ مِنْ آثَرِ السُّجُودِ (اُن کے ماتھوں پر سجدوں کے حسین و جمیل نشانات ہیں) یہ قول
ابو مسلم، اصم، قتادہ اور مورج کا ہے۔ پھر اس نشان کے تعین میں اختلاف ہے۔ ابو مسلم کے نزدیک
سفید نشانوں والے گھوڑے ہیں، اصم کے نزدیک بلقی گھوڑے، قتادہ کے نزدیک چتکبرے اور
مورج کے نزدیک الکی گھوڑے ہیں۔ امام رازی کہتے ہیں کہ اس بارے میں ابو مسلم کا قول زیادہ
صحیح ہے۔ کیونکہ آیت عمدہ اموال کی طرف اشارہ کرتی ہے اور حسین گھوڑا سفید نشانوں والا ہوتا
ہے۔ دوسرے لوگوں نے جو صفات بیان کی ہیں اُن سے گھوڑے کی عظمت ظاہر نہیں ہوتی۔

حجت بازی

فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ

اتَّبَعَنِ. (19:3)

پس اگر وہ آپ سے حجت بازی کیے جائیں تو کہہ دیجیے میں تو
اپنا رخ اللہ کی طرف کر چکا ہوں اور میرے قبعین بھی۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ بُت پرست تھے مگر ابراہیمؑ کی عظمت کا اقرار کرتے

تھے اور انہیں حق پرست بھی مانتے تھے، یہاں یہ کہا گیا کہ اگر وہ ابراہیم کو مانتے ہیں تو ان ہی کی طرح کہیں:

إِنِّي وَجْهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ
خَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ.

میں نے اللہ کے سوا تمام معبودوں سے منہ موڑ لیا اور صرف اُسی کی عبادت کا قصد کیا میں اُسی کا مخلص بندہ ہوں اور میں مشرکین میں سے نہیں۔

پس آیت کی تفسیر یہ ہوئی کہ:

”اے رسول خدا اگر یہود اور نصاریٰ زیادہ حجت بازی اور جھگڑا کریں تو انہیں کہہ دیجئے کہ میں اور میرے متبعین تو ابراہیم علیہ السلام کی طرح جھوٹے معبودوں سے منہ موڑ چکے تم بھی تو ایسا کر دکھاؤ۔“

تحدیر

يُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ. (29:2)

اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ اپنی پر عظمت اور صاحب اقتدار ذات سے تمہیں ڈراتا ہے۔ نفس کے ذکر کرنے سے یہ فائدہ ہے کہ اُس کی باجیروت ذات کا تصور آجائے اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ جو عقاب اس کی طرف سے ہو گا وہ بڑا عقاب ہو گا۔ کیونکہ وہ قوت و طاقت کا منبع ہے اور جب وہ کسی کو سزا دینا چاہے تو کائنات میں کوئی ایسی طاقت نہیں جو اُسے اس کے ارادہ سے باز رکھ سکے۔

زکریا

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً ۚ قَالَ آتُكَ إِلَّا تَكَلِّمَ النَّاسَ

ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمَازًا. (40:3)

ذکر یا نے عرض کیا اے میرے پروردگار میرے لیے کوئی
نشانی مقرر کر دے ارشاد ہوا کہ نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے بات نہ کرے
تین دن تک سوائے اشاروں کے۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کے یہ معنی ہیں کہ جب ذکر یا علیہ السلام نے اللہ سے معجزہ مانگا
تو اللہ نے حکم دیا کہ تین روز تک لوگوں سے باتیں نہ کر و صرف اشارات سے مطلوبہ چیزیں مانگ لیا
کر۔ اللہ کی تسبیح و تقدیس میں معروف رہو تین دن کے بعد مطلب حاصل ہوگا۔

مریم کی سرپرستی

إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ. (43:3)

جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی

سرپرستی کرے۔

ابو مسلم کے نزدیک پہلی اُمّیں تنازعہ کے وقت تیروں پر نام لکھ کر پھینکتی تھیں اور جس
کے حصے میں وہ آتا معاملہ اُس کے سپرد کیا جاتا جیسے ایک اور آیت ہے فَسَاهَمَ فَكَانَ مِنَ
الْمُدْحَضِينَ تو یہ طریقہ بھی قداح کے طریقہ کے مشابہ تھا جس کے ذریعہ اہل عرب اونٹوں کا
گوشت تقسیم کرتے تھے۔ تیروں کو اقلام اس لیے کہا گیا کہ وہ گھڑے جاتے تھے اور صاف کیے
جاتے تھے ہر وہ چیز جو تھوڑی تھوڑی کاٹی جائے اس کو ”قلمۃ“ یعنی قلم کرنا کہتے ہیں۔ قلم کو بھی
اسی لیے قلم کہتے ہیں کہ اُسے تراشا جاتا ہے۔

عیسیٰ پنگھوڑے میں

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا. (45:3)

اور وہ لوگوں سے گفتگو کریں گے گہوارہ میں اور پختہ عمر میں

بھی۔

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے ظاہر ہے مگر اس کی لغویت بھی واضح ہے کیونکہ پنگھوڑے میں کلام کرنا تو ایک طرح سے معجزہ ٹھہرایا جاسکتا ہے لیکن پختہ عمر میں تو ہر آدمی کلام کرتا ہے، اس میں خصوصیت کیا ہوئی۔ ابو مسلم کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام پنگھوڑے میں بھی ایسی پختہ اور دانشورانہ باتیں کرتے تھے جیسی بچگی عمر میں کی جاتی ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام مثیل آدم علیہ السلام

إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ طَخَلَقَهُ مِنْ

تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ. (58:3)

بے شک عیسیٰ علیہ السلام کا حال اللہ کے نزدیک آدم جیسا

ہے، اللہ نے انہیں خاک سے بنایا پھر حکم دیا وجود میں آ جاؤ چنانچہ وہ وجود میں آ گئے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ خلق کے معانی تقدیر اور تسویہ کے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ ہر چیز کی کیفیت اور اس کے وقوع کو بھی جانتا ہے اور یہ سب صفات ازلی وابدی ہیں تاہم کُن کا قول روح کے دخول سے عبارت ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تخلیق آدم پہلے ہوئی اور بعد میں کُن کا لفظ کہا گیا۔

قرآن اور ولادت مسیح

الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ. (59:3)

یہ امر حق تیرے رب کی طرف سے ہے سو کہیں تو شبہ کرنے

والوں میں نہ ہو جانا۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ آپ کو عیسیٰ علیہ السلام کے جو حالات بتائے گئے ہیں صحیح یہی ہیں یہود اور نصاریٰ کی روایات بالکل بے بنیاد ہیں۔ نصاریٰ نے کہا کہ حضرت مریم نے معبود کو جنم دیا اور یہود نے حضرت مریم پر بد چلنی کا بہتان لگایا (معاذ اللہ) پس دونوں

نے واقعات کو سخی کر دیا اور حق وہی ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔

قصص الحق

إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ. (61:3)

بے شک یہی سچے واقعات ہیں۔

ابو مسلم پھلی آیت (فَنَجْعَلُ لُغْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ) سے اس آیت کو مربوط

تسلیم کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ یہ قصے سچے ہیں اور ہم جھوٹوں پر لعنت بھیجتے ہیں۔

التباس حق و باطل

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ. (70:3)

اے اہل کتاب تم حق کی تلپیس باطل کے ساتھ کیوں کر رہے

ہو۔

آیت کے مفہوم میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ یہود و نصاریٰ کے سرداروں نے

اپنے ساتھیوں سے کہا ہو:

”منافت کرو اور مسلمانوں کے ساتھ ظاہری موافقت اختیار

کر لو لیکن اس شرط پر کہ اپنے دین کا رشتہ بھی ہاتھ سے نہ جانے دو تا کہ اس

سے مسلمانوں کی طاقت کمزور ہو اور ان کے اعتقاد و اعمال پر شب خون

مارو پس ان کے اعتقادات ضعیف ہو جائیں تو پھر کھلم کھلا اپنے مذہب کی

طرف آ جاؤ۔“

یہ قول ابو مسلم کا ہے اور اس کی تائید ان وجوہات سے بھی ہوتی ہے۔

(اِذْ لَمَّا) جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا تو اس کے معابعد

فرمایا بَشِيرِ الْمُنَافِقِينَ پس یہ آیت وَ إِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا الخ کے قائم

مقام ہے۔

(ثانیاً) آیت وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ کے بعد لائی گئی ہے۔ یہ دلالت کرتی ہے کہ انہیں اپنے دین کو چھوڑ کر کسی اور دین کو قبول کرنے کی ممانعت تھی، اُن کا یہ قول ابْنُوا بِهِ وَجْهَ النَّهَارِ بھی اسی منافقت پر دلالت کرتا ہے۔

میثاق الانبیاء

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحُكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَضْتُمْ وَ أَخَذْتُكُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ اصْرِيْ قَالُوا أَقْرَضْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَ أَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ. (80:3)

اور جب اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے عہد لیا کہ جو کچھ تمہیں کتاب و حکمت کی قسم سے ملے پھر تمہارے پاس کوئی رسول اس کی تصدیق کرنے والا آئے جو تمہارے پاس ہے تو تم ضرور اُس رسول پر ایمان لانا اور اُس کی نصرت کرنا۔ پھر فرمایا تم اقرار کرتے ہو اور یہ عہد قبول کرتے ہو؟ وہ بولے ”ہم اقرار کرتے ہیں۔“ فرمایا تو گواہ رہنا میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔

ابو مسلم کے نزدیک انبیاء کے پردے میں اُن کی اُمتوں سے یہ میثاق لیا گیا ہے۔ انبیاء کا میثاق محض اس قدر ہے کہ وہ اپنی اُمتوں کو آنے والے نبی کے متعلق بتاتے رہیں، اور یہ آنے والے نبی پیغمبر انسانیت حضور سرور کائنات ہیں۔ رَسُوْلٌ اگرچہ کرہ ہے مگر ایک فرد معین کی جانب اشارہ کر رہا ہے۔

الرسول هنا محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم في قول عليّ وابن عباس واللفظ زان كان نكرة
فالإشارة الى معين.

علیٰ اور ابن عباسؓ کے قول کے مطابق رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، لفظ اگرچہ نکرہ ہے لیکن اشارہ معین کی طرف ہے۔
(تفسیر قرطبی)

ظاہر ہے کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت کوئی نبی بھی دنیا میں موجود نہ تھا اور جب انتقال ہو جائے تو انسان کسی چیز کا مکلف نہیں رہتا حالانکہ میثاق ایمان لانے اور نصرت کرنے کا لیا گیا ہے اور یہ تقاضا زندوں سے ہی کیا جاسکتا ہے پس میثاق اُمتوں سے ہی لیا گیا۔ اس کی تائید آیت کے آخری حصہ سے بھی ہوتی ہے کہ اُن سے کہا جا رہا ہے۔ ”پس اگر تم نے پیٹھ پھیری تو فاسق ہو جاؤ گے۔“ اور حق سے پیٹھ پھیرنا انبیاء کے شایانِ شان نہیں۔ نبی سے خطاب کے پردے میں پوری اُمت کو خطاب کرنے کا اصول قرآن میں عام ہے جیسے یَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ۔ انبیاء میں ”فرق“ کرنا

لَا تُفَرِّقْ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ۔ (83:3)

ہم ان میں باہم کوئی ”فرق“ نہیں کرتے۔

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے ظاہر ہے۔ ”لَا تُفَرِّقْ“ کا وہ یہی مفہوم لیتے ہیں کہ ہم درجات کے لحاظ سے انبیاء میں فرق نہیں کریں گے۔ لیکن ابو مسلم اس قول کا سختی سے انکار کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ پیغمبروں میں درجات کے لحاظ سے فرق ہے اور اس پر خود کتاب اللہ شاہد ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ (ان رسولوں میں سے ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت عطا کی ہے)۔ پس جب بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہوئی تو مراتب اور درجات میں فرق کرنا اور کس چیز کا نام ہے۔ اصل میں فرق کے معنی جدا کرنے کے ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا۔

اللہ کی رسی کو مجتمع ہو کر مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں افتراق

نہ ڈالو۔

آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم انبیاء میں جدائی نہیں ڈالتے یعنی ایسا نہیں کرتے کہ کسی

ایک نبی کا بھی انکار کر دیں۔ ہم تمام انبیاء کو مانتے ہیں۔
مسلم کے معنی

وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ. (83:3)

اور ہم اُسی کے مطیع ہیں۔

ابو مسلم کہتا ہے کہ اپنی رضا سے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کرنے والے کو مسلم کہتے ہیں۔

تَبَيُّضٌ وَجْوهٌ وَتَسْوَدُّ وَجْوهٌ کا مفہوم

يَوْمَ تَبْيَضُّ وَجْوهٌ وَتَسْوَدُّ وَجْوهٌ فَأَمَّا الَّذِينَ

اسْوَدَّتْ وَجُوهُهُمْ فَبِئْسَ الْكُفْرُ ثُمَّ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ

بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ. وَاَمَّا الَّذِينَ اَبْيَضَّتْ وَجُوهُهُمْ فَبِئْسَ

اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ. (3 : 106-105)

اُس روز بعض چہرے سفید ہوں گے اور بعض سیاہ ہوں گے

پھر جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا کہ کیا تم ہی کافر

ہوئے تھے ایمان کے بعد سو عذاب چکھو اپنے کفر کی پاداش میں، اور جن

کے چہرے سفید ہوں گے وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اُسی میں

ہمیشہ رہیں گے۔

جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے مفسرین نے ”تَسْوَدُّ“ اور ”اَبْيَضَّتْ“ سے چہروں کا

واقعاً سیاہ اور سفید ہونا مراد لیا ہے، مگر ابو مسلم کو ان معانی سے اختلاف ہے۔ اُن کے نزدیک یہ

الفاظ حقیقی معنوں میں نہیں بلکہ مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہیں۔ جس طرح دوسری جگہ اللہ کا

ارشاد ہے:

وَجْوهٌ يَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ صَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ وَوَجْوهٌ

يَّوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ.

کچھ چہرے اُس روز چمک رہے ہوں گے، ہنستے مسکراتے
خوش، خوش خبری پالینے والے اور کچھ چہرے ایسے ہوں گے کہ ان پر غبار
ہوگا، سیاہی ان پر چھائی ہوگی۔

اس آیت میں ”مسفرہ، ضاحکہ اور مستبشرہ“ کے مقابلہ میں ”غبرہ“
اور ”قترہ“ کے الفاظ ہیں، اس لیے ”غبرہ“ اور ”قترہ“ کے اصلی معانی چھوڑ کر ضاحکہ
اور مستبشرہ کی رعایت سے مجازی معنی لینے ہوں گے پس غبرہ اور قترہ کے معنی غمگین و
حزین ہوں گے۔ اسی طرح آیہ زیر بحث میں بھی ”تَبَيُّضٌ“ اور ”تَسْوَدٌ“ کے مجازی معنی لیے
جائیں گے۔

بیاض کے مجازی معنی فرحت و انبساط ہیں اور سواد کے مجازی معنی حسرت و غم ہیں اور یہ
عام استعمال میں آتا ہے، کتاب اللہ میں ہے:

إِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ بِالْأُنْثَىٰ ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ
كَظِيمٌ.

اور جب ان میں سے کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جاتی ہے

تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے۔

یعنی اُس کے چہرے پر حسرت و افسوس کے آثار نمایاں ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح
کہا جاتا ہے ”لفلان عندی ید بیضاء“ کہ فلاں کے لیے میرے پاس مسرت و انبساط کا
پیغام ہے۔

اور بعض نے بڑھاپے کے متعلق بھی یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

عند بیض الوجوه سود القرون	یا بیاض القرون سودت وجهی
عن عیان و عن عیان العیون	فلعمری لا خفینک جھدی
و سواد لوجھک الملعون	بسواد فیہ بیاض لوجھی

اے میری مانگ کی سفیدی تو نے کالی مانگوں اور سفید چہروں

والوں کے سامنے مجھے روسیاہ کر دیا۔ مجھے اپنی زندگی کی قسم کہ میں تجھے
لوگوں سے اور آنکھوں کے مشاہدے سے چھپانے کی پوری کوشش کروں
گا جس میں میری سرخروئی ہوگی اور تیرا ملعون چہرہ سیاہ ہو جائے گا۔

جو اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے اور مراد پالے تو اہل عرب کہتے ہیں: ”ابيض
وجہہ“ مبارک اور خوشخبری کے وقت کہتے ہیں: ”الحمد لله بيض وجہک“ اور جو
ناکامیوں اور نامرادیوں کا شکار ہو تو کہتے ہیں: ”اغبر وجہہ“ تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ
اُس روز مومن اپنے نیک اعمال کے باعث کامران و بامراد ہوں گے اور کفار اپنی بدکرداریوں کی بنا
پر حسرتوں اور ناکامیوں کا مرقع بن جائیں گے۔

خیر الامم

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ (109:3)

تم وہ بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہ آیت اَمَّا الَّذِيْنَ اَبْيَضَتْ وَجُوهُهُمْ کے تابع ہے یعنی جن
لوگوں کو آخرت میں کامرانی حاصل ہوگی وہ یہی لوگ ہیں جنہیں دنیا میں بھی نسل انسانی کے لیے
چھانٹ کر انتخاب کر لیا گیا ہے۔

اللہ کا اذن

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ (144:3)

اور اللہ کے اذن کے بغیر کوئی نہیں مرتا۔

ابو مسلم کے نزدیک اذن سے مراد روح قبض کرنے کا حکم ہے پس اس حکم کے بغیر کسی کو
موت نہیں آ سکتی۔

اللہ کا وعدہ

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهُ (151:3)

اور بے شک اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

مجموعہ تفاسیر ابو مسلم اصنفائی — 127

اللہ نے تقویٰ اور صبر کی شرط پر اُن سے نصرت کا وعدہ کیا اور جب اُنہوں نے یہ شرط پوری کر دی تو اللہ نے بھی اپنا وعدہ پورا کر دیا۔

کفار کا مرعوب ہونا

سَنَلْقَىٰ فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ (150:3)

ہم جلد ہی کفار کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیں گے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کا وعدہ صبر و استقلال اور تقویٰ و پرہیزگاری سے مشروط تھا۔ مسلمانوں نے ذرا سی کمزوری دکھائی تو کفار کے دلوں سے اُن کی ہیبت اُٹھ گئی، یہ ایک ابتلا تھا تا کہ وہ توبہ کریں اور پھر اللہ کی نصرت کی شرط پوری کریں تو اللہ اسی طرح اُن کی مدد کرے گا اور کافروں کے دلوں میں اُسی طرح اُن کا رعب موجود ہوگا۔

نبوت اور خیانت؟

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ (160:3)

اور کسی نبی کی یہ شان ہی نہیں کہ وہ خیانت کرے۔

جنگِ بدر کے بعد جب مالِ غنیمت تقسیم ہو رہا تھا تو ایک سرخ رنگ کا بُجہ ذخیرہ سے غائب تھا۔ کوئی آدمی کہہ بیٹھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لے لیا ہوگا۔ اگر یہ شخص منافق تھا تو اُس نے خیانت جیسی ناروا صفت نبیؐ سے منسوب کی تھی اور اگر نادانِ قف نو مسلم تھا تو اُسے شاید یہ معلوم نہ تھا کہ نبیؐ اپنی مرضی سے اس طرح چیزیں نہیں لے لیتا کہ کسی کو علم تک نہ ہو، پس اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خیانت نبوت کی شان کے منافع ہے اور خیانت کرنے والے سے اللہ قیامت کو نیپٹ لے گا۔ یہ آیت دامنِ نبوت کو آفتاب کی طرح روشن دکھا رہی ہے اور سب غلط خیالوں کی اصلاح کر رہی ہے۔

سورة النساء

خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا كَامِفْهُوم

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ

وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا (1:4)

اے لوگو اپنے اُس رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں

ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے اسرائیلی روایات سے متاثر ہو کر عجوبہ پرستی کی ایک

نئی عمارت کھڑی کی ہے۔ مِنْهَا زَوْجَهَا کے الفاظ دیکھ کر تخلیق حوا کے متعلق عجیب و غریب حکایت

بیان کی ہے کہ آدم علیہ السلام پیدائش کے بعد اکیلے زمین پر پھرتے تھے اور ہم جنس نہ پا کر بے

چین رہتے تھے۔ دوسرے جمعہ کو آدم علیہ السلام سو رہے تھے کہ فرشتوں نے اُن کی بائیں پسلی

چاک کی اور اُس سے حضرت حوا کو نکالا۔ یوں حوا پیدا ہو گئیں۔ یہ حکایت نہ قرآن میں ہے نہ

حدیث میں۔ بلکہ توریت کے قصہ کی لفظی نقل ہے۔ توریت کا بیان حسب ذیل ہے:

”خداوند خدا نے آدم پر پیاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا اور اُس

نے اُس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اُس کے بدلے گوشت بھر

دیا اور خداوند خدا نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک

صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجا۔“ (پیدائش 2-22-23)

ابو مسلم کے خیال میں وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا کے معنی ہیں من جنسہا یعنی اُس کی

جنس سے اُس کا جوڑا پیدا کیا، جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا.

اللہ نے تمہارے نفسوں سے (جنس سے) تمہارے جوڑے

پیدا کیے۔

ظاہر ہے کہ اگر منہا سے پہلی سے نکالنا مراد تھا تو یہاں گویا تمام دنیا کے مردوں کی بیویاں اُن کی پسلیوں سے نکلیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے:

إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ.

جب اللہ نے اُن کی جنس سے ہی رسول مبعوث فرمایا۔

وراثت میں لڑکے اور لڑکی کا حصہ

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنثَيَيْنِ (11:4)

مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک اس آیت سے یہ لازم آتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو تہائی ہو، کیونکہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے اور جب لڑکے کا حصہ دو تہائی ہو تو لڑکی کو ایک تہائی ملنا چاہیے۔

منافق اور مصیبت کا سامنا

فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ (62:4)

پس کیسے گزرتی ہے جب اُن پر مصیبت آ پڑتی ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ پہلے اللہ نے منافقوں کے حالات بتائے وہ کس طرح شیطان کی راہوں پر چل نکلے ہیں اور حضور کے احکام سے منہ پھیرتے ہیں۔ رسول اکرم کو بشارت دی کہ ان پر ایسی مصیبتیں ٹوٹنے والی ہیں کہ وہ پھر خاسر و نامراد آپ کے پاس آ کر پناہ لیں گے اور اپنے مومن ہونے کا اظہار کریں گے اور قسمیں کھا کھا کر اپنی صداقت کا یقین دلانے کی کوشش کریں گے۔ پس جب یہ مصیبت اُن پر آ پڑی تو کیسی گزرے گی۔ اہل عرب بشارت اور انذار کے وقت کہتے ہیں:

”كَيْفَ أَنْتَ إِذَا كَانَ كَذَا وَكَذَا“

جب معاملہ ایسا ایسا ہو جائے تو تجھ پر کیا گزرے گی۔

قرآن میں بھی بیشتر مقامات پر یہی طرز بیان اختیار کی گئی ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ.

جب ہر قوم پر ہم گواہ لے آئیں گے تو پھر کیا گزرے گی۔

ایک اور مقام پر ہے:

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ.

پس جب ہم اس روز جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی

شک نہیں، تو ان پر کیا گزرے گی۔

سورة المائدة

نہیحت بھول جانے والے

وَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ ۚ وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلَى

خَائِنَةٍ مِنْهُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاصْفَحْ (13:5)

اور جو ان کو نہیحت کی گئی تھی اُس کا ایک حصہ بھول گئے اور ان

میں سے تھوڑے لوگوں کے سوا تو ان کی خیانت پر خبر پاتا رہے گا، سو ان کو

معاف کر اور درگزر کر۔

ابو مسلم کے نزدیک اس آیت کا یہ مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کو حکم دیا تھا کہ ان

سے درگزر فرمائیں اور جب تک وہ عہد پر کاربند رہیں ان کی معمولی لغزشیں معاف فرمائیں۔ قلیل

سے وہ کافر مراد لیے جاسکتے ہیں جو اپنے کفر پر باقی رہے۔

نقیب کے معنی

وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيبًا ط (12:5)

اور ہم نے ان میں سے بارہ سردار مقرر کیے۔

ابو مسلم کے نزدیک یہاں نقیب بطور فعیل مفعول کے معنوں میں استعمال ہوا ہے جس

طرح قتل مقتول کے معنوں میں آتا ہے اسی طرح نقیب منقوب کے معنوں میں ہے یعنی انہیں

چنا گیا۔

غراب

فَبَعَثَ اللَّهُ غُرَابًا (31:5)

پس اللہ نے کوا بھیجا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کے بیٹوں میں جھگڑا ہوا اور ایک بھائی نے دوسرے کو قتل کر دیا تو وہ پریشان کھڑا تھا کہ اب لاش کو کیا کرے، پس دو کوڑے آئے، ایک نے دوسرے کو مار ڈالا اور دفن کر دیا۔ اس سے اُسے بھی لاش چھپانے کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ ابو مسلم کہتے کہ دو کوڑے نہیں صرف ایک کو ابھیجا گیا تھا، چونکہ کوڑوں کی عادت ہی چیزوں کو چھپانا ہے اس لیے اُس کوڑے نے کوئی چیز دفن کی جس سے قاتل نے بھی لاش چھپانا سیکھ لیا۔

رکوع

يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ. (55:5)

وہ صلوٰۃ قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک رکوع سے مراد خشوع اور عاجزی و انکساری ہے یعنی وہ صلوٰۃ قائم کرتے زکوٰۃ ادا کرتے اور اللہ کے تمام احکام کے آگے عجز و خشوع سے سر جھکا دیتے ہیں۔

سورة الأنعام

اجل اور اجل مسمی

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ طِينٍ ثُمَّ قَضَىٰ أَجَلًا وَأَجَلٌ مُّسَمًّى عِنْدَهُ ثُمَّ أَنْتُمْ تَمْتَرُونَ. (2:6)

وہ ذات ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک میعاد ٹھہرا دی اور ایک اور میعاد اُس کے ہاں معین ہے پھر بھی تم بھگڑتے ہو۔
ابو مسلم کے نزدیک أَجَلًا سے پہلے لوگوں کی موت مراد ہے اور ”أَجَلٌ مُّسَمًّى“ سے باقی لوگوں کی موت مراد ہے۔ پچھلے لوگ تو مر گئے اس لیے اُن کی موت کا وقت معلوم ہو گیا اور جو باقی ہیں وہ مرے نہیں اس لیے اُن کی موت کا علم (عِنْدَهُ) اللہ کے پاس ہے۔

زمان و مکان

وَلَهُ مَا سَكَنَ فِي اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ. (13:6)

اور اُس کا ہے جو کچھ رات اور دن میں بستا ہے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ اس سے پچھلی آیت میں آسمانوں اور زمینوں کا ذکر کر کے تسلیم کرایا کہ ”مکان“ اللہ کی ملکیت ہے، اور اس آیت میں شب و روز کا ذکر کر کے ثابت کیا جا رہا ہے کہ ”زمان“ بھی اللہ کی ملکیت میں ہے۔ زمان و مکان حادثاتِ حیات کے لیے ظرف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اللہ نے خبر کر دی کہ وہ زمان و مکان اور اُن کے متعلقات کا خالق اور مالک ہے۔

مستقر اور مستودع

وَهُوَ الَّذِي أَنْشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ

مُسْتَوْدَعٌ. (99:6)

اور وہی ذات ہے جس نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا پھر
ایک ٹھہرنے کی جگہ ہے اور ایک سو نپا جانے کی۔
ابو مسلم کے نزدیک اس کی ترتیب یوں ہے:

”هُوَ الَّذِي أَنشَأَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ فَمِنْكُم مَّسْتَقَرٌّ
ذَكَرٌ وَمِنْكُم مَّسْتَوْدَعٌ أُنْثَى“

اللہ نے مذکر کی تعبیر مستقر سے کی کیونکہ نطفہ اس کی پیٹھ میں پیدا ہوتا ہے اور وہیں قرار
پکڑتا ہے اور مؤنث کی تعبیر مستودع سے کی کیونکہ رحم کو گویا نطفہ سو نپ دیا جاتا ہے۔

النَّارُ مَثْوَاكُمْ

قَالَ النَّارُ مَثْوَاكُمْ خَالِدِينَ فِيهَا إِلَّا مَا شَاءَ

اللَّهُ. (129:6)

(اور وہ کہیں گے ہم اپنی میعاد کو پہنچ گئے) اللہ کہے گا آگ

تمہارا ٹھکانا ہے اس میں رہو گے مگر جو چاہے اللہ۔

اس سورۃ میں اگرچہ کفار کا ذکر ہے مگر اِلَّا کی استثنا سے بعض لوگوں نے یہ مفہوم اخذ کیا
ہے کہ دوزخ میں بھی ہمیشہ کوئی نہیں رہے گا۔ ابو مسلم کے نزدیک اس استثنا کا تعلق خلوص سے نہیں
بلکہ اس کا تعلق وَبَلَّغْنَا أَجَلَنَا الَّذِي أَجَّلْنَا لَنَا سے ہے یعنی وہ کہیں گے ہم اپنی اُس مقرر
میعاد کو پہنچ گئے جو اے اللہ تو نے ہمارے لیے مقرر کر رکھی تھی۔ حالانکہ بعض کو تو نے وقت سے پہلے
ہلاک کر دیا جیسے ”الَّذِينَ يَسِرُّوا كُنُوزَهُمْ أَهْلُكُنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ قَبْلِهِمْ“ سے ظاہر ہے جیسا کہ قوم نوح
اور قوم عاد و ثمود سے کیا گیا۔ پس کلام کا خلاصہ یوں ہوگا کہ وہ یوں کہیں گے کہ ہم میں سے بعض
نے بعض سے سنا کہ جو کچھ ہمارے لیے مقرر کیا گیا وہ ہم تک پہنچا اور جس قوم کو تو نے چاہا وقت
سے پہلے ختم کر دیا (إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ) ویسے اِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ کا استثنا بالمشیت ثبوت اور استمر

کے لیے آتا ہے۔ اس کی تفصیل نسخ منسوخ کے تحت آچکی ہے۔
تیسری مخلوق

إِنْ يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِنْ بَعْدِكُمْ مَا

يَشَاءُ. (134:6)

اگر خدائے بے نیاز چاہے تو تمہیں ختم کر دے اور تمہارے

بعد جن کو چاہے تمہارا جانشین بنادے۔

ابو مسلم کے نزدیک آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس طرح تمہیں جنوں کا جانشین

کیا اسی طرح وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ کوئی تیسری مخلوق پیدا کر کے انسانوں کی جانشین بنا

دے۔

سورة الاعراف

شیطان اور آدم و حوا

فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ. (20:7)

پھر شیطان نے دونوں کو وسوسہ ڈالا۔

ابو مسلم فرماتے ہیں جنت سے زمین کا کوئی باغ مراد ہے اور آدم و حوا کے ساتھ وہیں ابلیس بھی تھا اور یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ ابلیس سانپ کے پیٹ میں داخل ہوا اور پھر سانپ جنت میں داخل ہو گیا تو قصہ چاہے کتنا ہی مشہور کیوں نہ ہو سراسر لغو اور باطل ہے۔

رجفہ

فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ. (78:7)

پس انہیں زلزلہ نے آلیا۔

بعض ملاحدہ نے ان آیات پر یہ اعتراض کیا ہے کہ قرآن قوم ثمود کی تباہی کو مختلف مقامات پر مختلف الفاظ سے تعبیر کرتا ہے۔ یہاں بتایا گیا کہ ”رجفہ“ سے تباہی ہوئی، کہیں اس لفظ کی بجائے ”طاغیہ“ کا لفظ استعمال کیا ہے اور کہیں ”صبحہ“ کا۔ ابو مسلم نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا ہے کہ ”طاغیہ“ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنی حدود سے تجاوز کر جائے چاہے وہ حیوان ہو یا غیر حیوان۔ ”طاغیہ“ کے آخر کی ہا (ة) معنوں میں زیادتی پیدا کرنے کے لیے بڑھاؤ لگائی ہے۔ اسی لیے مسلمان ظالم بادشاہ کو ”طاغوت“ اور ”طاغیہ“ کہتے ہیں۔ ارشاد باری ہے إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ (بے شک انسان سرکشی کرتا ہے) طغی سے طغیان، طاغ اور طاغیہ صیغے آتے ہیں۔ غیر حیوان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے ”انما طغی الماء“ اُس وقت کہا جاتا ہے جب پانی غالب آ جائے اور اپنی حدود سے تجاوز کر جائے۔ رجفہ

سے مراد زمین کا ہلنا ہے۔ یہ وہ حرکت زمین ہے جو عام حرکت سے مختلف ہوتی ہے۔ پس اس پر اگر طاعیہ کے لفظ کا اطلاق کیا جائے تو بلاغت ہے تناقض نہیں۔ رہا ”صیحہ“ کا لفظ تو اس کا اطلاق ہمیشہ زلزلہ پر ہوتا ہے۔ پس محدثین کا قول باطل ہو جاتا ہے۔

تیس (30) راتیں

وَاعْذَنَا مُوسَى ثَلَاثِينَ لَيْلَةً وَاتَّمَمْنَاهَا بِعَشْرِ فِتْمٍ

مِيقَاتُ رَبِّهِ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً. (142:7)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ ٹھہرایا اور اس کو دس اور

راتوں سے پورا کیا تب اس کے رب کی مدت چالیس رات پوری ہوئی۔

ابو مسلم نے سورہ طہ کی تفسیر میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے تیس روز طور پر گزارے تھے کہ اللہ نے خبر دی ”سامری نے تیری قوم کو گم راہ کر دیا ہے۔“ اس پر وہ واپس چلے گئے اور پھر دس دن کے لیے آئے، اس طرح چالیس راتیں پوری ہوئیں۔

منكبرين في الارض

سَاصِرْفَ عَنِ الْيَسَى الَّذِينَ يَتَكَبَّرُونَ فِي الْأَرْضِ

بِغَيْرِ الْحَقِّ. (146:7)

میں اپنی آیات سے اُن لوگوں کو پھیر دوں گا جو زمین میں

ناحق تکبر کرتے ہیں۔

کبھی اور ابو مسلم کے نزدیک یہ کلام اس وعدہ کا پورا کرنا ہے جو اللہ نے موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کو ہلاک کرنے کے متعلق کیا تھا۔ پس وہ اب اس بات پر قادر نہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو تبلیغ سے روکیں اور نہ مسلمانوں کو ایمان لانے سے منع کر سکتے ہیں۔ یہ آیت اسی کے مشابہ ہے:

وَبَلَّغْ مَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا
بَلَغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ.

جو کچھ آپ کے رب نے آپ کی طرف نازل کیا اس کی تبلیغ
کیجیے اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو فریضہ رسالت ادا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ
آپ کو لوگوں سے بچائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے ارادہ فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کے دشمنوں کو ایذا دینے سے روکے اور
مانعین تبلیغ کو ختم کرے۔

موسیٰ علیہ السلام کا قوم کی طرف لوٹنا

وَلَمَّا رَجَعَ مُوسَىٰ إِلَىٰ قَوْمِهِ غَضْبَانَ أَسِفًا (150:7)
اور جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف لوٹے غضب

ناک اور متاسف۔

ابو مسلم کے نزدیک موسیٰ علیہ السلام کو آنے سے پہلے علم تھا کہ سامری نے آپ کی قوم کو
گم راہ کر دیا ہے۔ خود یہی آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کیونکہ وہ واپس آئے تو غضب ناک
اور متاسف تھے۔ دوسرے اللہ نے اس واقعہ کا ذکر میقات میں کر دیا تھا۔

مثال

وَأْتَلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ الَّذِي آتَيْنَاهُ آيِنًا فَانْسَلَخَ

مِنْهَا. (157:7)

اور ان پر اُس شخص کی خبر پڑھ جس کو ہم نے اپنی آیات دیں

پھر وہ انہیں چھوڑ نکلا۔

جہور مفسرین نے اس آیت سے کوئی متعین شخص مراد لیا ہے بعض نے بلعم باعور، بعض
نے کوئی راہب اور بعض نے اُمیہ کا ذکر کیا ہے، لیکن قنادہ، عکرمہ اور ابو مسلم کا قول ہے کہ وہ کوئی

متعین شخص نہ تھا۔ یونہی ایک عام مثال پیش کی گئی ہے کہ جس آدمی نے بھی ہدایت سے منہ موڑا وہ شیطان کا قبیح ہوا اور اس طرح رفعتوں کو چھوڑ کر پستیوں میں چلا گیا۔ ابو مسلم کے نزدیک اتینسہ کے معنی ہیں یینسہ اور انسلیخ اور عزلی مترادف ہیں اور اس آیت کا اطلاق ہر اس کافر پر ہوتا ہے جو دلائل کے باوجود ایمان نہ لائے اور اپنے کفر پر قائم رہے۔ اس کی مثال یہ آیت ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا

لِمَا مَعَكُمْ مِنْ قَبْلُ اَنْ تَطْمِئِنَّ وُجُوْهُكُمْ.

سورة التوبة

مشرکین اور مساجد

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِينَ أَنْ يَعْمُرُوا مَسْجِدَ اللَّهِ شَاهِدِينَ
عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ بِالْكَفْرِ. (18:9)

مشرکوں کا کام نہیں کہ اپنے اوپر کفر کی گواہی دیتے ہوئے
مساجد آباد کریں۔

یعنی اس حالت میں جب کہ وہ عملی طور پر کفر و شرک کے مرتکب ہیں تو ایسے کام انہیں
کوئی فائدہ نہیں دے سکتے کیونکہ یہ فردعی نیکیاں تو اسی کو فائدہ دیتی ہیں جو اللہ، رسول اور قیامت پر
ایمان لائے، صلوة قائم کرے، زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ کرے۔

امید

فَعَسَىٰ أُولَٰئِكَ أَنْ يَكُونُوا مِنَ الْمُهْتَدِينَ. (19:9)

سو امید ہے کہ یہ لوگ (مومن) ہدایت پانے والوں میں سے ہوں۔

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ آیت میں شک اور تذبذب ہے جو اللہ کے لیے جائز نہیں۔
ابو مسلم کہتے ہیں فَعَسَى (سو امید ہے) کا تعلق بندوں سے ہے، تو معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ
اعمال صالحہ کرتے ہیں تو صرف کامیابی کی امید پر کرتے ہیں جس طرح اس آیت سے ثابت
ہوتا ہے:

وَيَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا.

اور وہ اُمید و بیم کے عالم میں اپنے رب کو پکارتے ہیں۔

بندہ جب نیک اعمال کرتا ہے تو بدلہ میں اپنی فوز و فلاح کی اُمید رکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا

ہے کہ مقبولیت کے حصول میں جوڑ کا ونیس تھیں وہ اس نے دُور کر دیں مہندین سے مراد انعام پانے والے اور کامیاب ہونے والے ہیں۔

کتاب اللہ

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ

اللَّهِ. (36:9)

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک اُس کے حکم سے بارہ مہینے

ہے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ کتاب اللہ سے مراد اللہ کا حکم اور اس کا قانون ہے جیسے فرمایا:

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ.

تم پر قصاص فرض کیا گیا۔

استہزا

يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَنْ تُنْزَلَ عَلَيْهِمْ سُورَةٌ تُنَبِّئُهُمْ بِمَا

فِي قُلُوبِهِمْ ؕ قُلِ اسْتَهْزَؤْا إِنَّ اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ.

(64:9)

منافق ڈرتے ہیں کہ اُن کے متعلق کوئی سورت نہ اُتاری

جائے جو اُن کے دلوں کے بھید کھول کر بیان کر دے، فرما دیجیے کہ تم استہزا

کیے جاؤ اور اللہ اس کو کھولنے والا ہے جس کا تمہیں خوف ہے۔

ابو مسلم کا خیال ہے کہ اس اندیشے کا اظہار منافقین نے بطور استہزا کیا، کیونکہ حضورؐ کہتے

تھے کہ مجھ پر اللہ وحی نازل کرتا ہے تو منافقوں کا خیال تھا کہ پھر اللہ انہیں منافقوں کے بارے

کیوں نہیں بتا دیتا۔ دوسری طرف اُن کے دلوں میں یہ خوف بھی موجود تھا کہ کہیں سچ مچ اللہ انہیں

خبردار نہ کر دے۔ پس اللہ نے کہا کہ وہ ان کے دلوں کے بھید کھولنے والا ہے۔ قُلِ اسْتَهْزَؤْا

(فرمائیے کہ استہزا کیے جاؤ) سے یہ مراد بھی لی جاسکتی ہے کہ اللہ نے بطور طنز فرمایا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہے کہ تم جب اپنے شیطانوں سے ملتے ہو تو کہتے ہو: انا معکم انما نحن مُسْتَهْزِءُونَ۔

ہم تو تمہارے ساتھی ہیں مسلمانوں سے تو محض استہزا کرتے ہیں۔

قبولیت توبہ کی بشارت

اَلَمْ يَعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰهَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ۔ (104:9)

کیا وہ نہیں جانتے کہ اللہ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں چاہے اَلَمْ کو استفہام کہو مگر اس سے مقصود خبر دینا ہے، اسے استفہام استخاری کہتے ہیں۔ اہل عرب کی عادت ہے کہ مخاطب کے ازالہ شک کے لیے بھی استفہام لاتے ہیں۔ جیسے کہتے ”اما علمت يجب عليك خدمته“ (کیا تو نہیں جانتا کہ اس کی خدمت تیرا فرض ہے)۔ یا کہا جاتا ہے ”اما علمت ان من احسن اليك يجب عليك شكره“ (کیا تو نہیں جانتا کہ جس نے تجھ پر احسان کیا اُس کا شکریہ ادا کرنا تجھ پر لازم ہے)۔ اس آیت میں اللہ نے توبہ کرنے والوں کو توبہ کی قبولیت کی بشارت دی اور پھر بطور تاکید فرمایا کہ وہ توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

شہادت

قُلْ اَعْمَلُوا فَاَسِيرَی اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهُ

وَالْمُؤْمِنُوْنَ۔ (105:9)

فرمائیے کہ عمل کرو اللہ، رسول اور مومن تمہارا عمل دیکھ لیں گے۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ مومن قیامت کے روز اللہ کے گواہ ہوں گے (كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ

.....) اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی گواہ ہیں (فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيدٍ) اور دوسری جگہ ہے (وَجِئْنَا بِكَ عَلٰی هٰؤُلَاءِ شَهِيدًا)۔

پس اس آیت سے مقصود تنبیہ ہے کہ قیامت کے روز تمہارے اعمال سامنے آ جائیں گے۔

السَّائِحُونَ

الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَامِدُونَ

السَّائِحُونَ. (112:9)

توبہ کرنے والے، عبادت کرنے والے، حمد کرنے والے، سفر کرنے والے۔

ابو مسلم کے نزدیک السَّائِحُونَ سے سفر کرنے والے لوگ مراد ہیں اس کا مادہ السح ہے، پانی کے جاری ہونے کو سح الماء کہتے ہیں، یعنی جو لوگ جہاد اور ہجرت کے لیے سفر کرتے ہیں۔

ساعتِ عسرت

لَقَدْ تَابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِينَ

وَالْأَنْصَارِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ الْعُسْرَةِ. (117:9)

اللہ نبی پر اور ان مہاجرین و انصار پر مہربان ہوا جنہوں نے

بتگلی کی گھڑی میں اس کی اتباع کی۔

ابو مسلم کہتے ہیں: ساعتِ عسرت سے وہ تمام تکالیف مراد لی جاسکتی ہیں جن میں حضورؐ،

مہاجرین اور انصار مبتلا ہوئے، غزوات بھی اس میں شمار ہوں گے اور اس سے مطلب مہاجرین اور

انصار کی تعریف ہے اور ان سے زیادہ عظمت اور بزرگی کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ جس کی اللہ بھی

مدح کرے۔

سورۃ یونس

الرّٰ کے معنی

الرّٰ تِلْكَ اٰیٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ. (1:10)

الرّٰ۔ یہ حکمت والی کتاب کی آیات ہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک الرّٰ سے حروف تہجی کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ وہ حروف ہیں جن کی ترتیب سے ایسی بڑی عظمت اور معجزہ نما کتاب وجود میں آئے۔ ابن عباسؓ کے نزدیک الرّٰ سے مراد انا اللہ ارمی (یعنی میں اللہ دیکھ رہا ہوں)۔

استوی علی العرش

ثُمَّ اسْتَوٰی عَلٰی الْعَرْشِ. (3:10)

پھر وہ عرش کی طرف متوجہ ہوا۔

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ آسمانوں کے اوپر ایک بہت بڑا تخت ہے جس کو عرش کہتے ہیں، لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ عرش کا یہ مفہوم نہیں، اصل میں تمام تعمیر کے کام کو عرش کہتے ہیں اور بنانے والے کو عاشر کہا جاتا ہے مِنْ شَجَرَةٍ وَمِمَّا يَعْرِشُونَ اس آیت میں يَعْرِشُونَ کے معنی یسبون کے ہیں۔ دوسری جگہ ایک بستی کی ہلاکت و تباہی کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرمایا فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرْوَتِهَا اور مطلب یہ ہے کہ اس بستی میں مکان اپنی بنیادوں پر استوار ہیں، چھتیں موجود ہیں لیکن رہنے والوں سے خالی ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا وَ كَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ یعنی اس کی بنیاد پانی پر ہے اور اس آیت کو اپنی قدرت کے اظہار کے لیے پیش فرمایا کیونکہ مکانوں کو پانی سے دور خشک زمین پر بنایا جاتا ہے اور اللہ نے زمین کو پانی پر بنایا تا کہ صاحب عقل لوگ اس کی قدرت کو پہچانیں۔ پھر آیت کے آخر میں فرمایا گیا ”کیا تم نصیحت حاصل نہیں کرتے“ اس

سے بھی استدلال کیا جاسکتا ہے کیونکہ نصیحت اُس چیز سے لی جاسکتی ہے جو آنکھوں کے سامنے ہے تو آسمانی عرش جسے ہم دیکھ بھی نہیں سکتے وہ کس طرح صانع کے وجود پر دلالت کر سکتا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے ارض و سموات کی تخلیق کی۔ پھر اس کی سطح بنائی اور اس کی مختلف شکلیں (جو اُس کی مصلحتوں کے مطابق تھیں) بنائیں۔ (ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ) اِس آیت میں بھی یہی مفہوم بیان ہوا ہے اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَم السَّمَاءُ بَنَاهَا. رَفَعَ سَمُكَهَا فَسَوَّاهَا سب سے پہلے اس کا بنانا ذکر کیا پھر اُس کو بلند کرنے کا تذکرہ کیا پھر اُس کو صحیح شکل دینے کے متعلق بیان ہوا۔ پس یہاں بھی پہلے زمین و آسمان کی تخلیق کا ذکر ہوا پھر ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ کے الفاظ سے یہ اشارہ کیا کہ تخلیق کے بعد اُس کو صحیح شکل دی گئی۔

پکار

دَعُواهُمْ فِيهَا سُبْحَنَكَ اللَّهُمَّ. (10:10)

اُن کی پکار یہ ہے کہ اے اللہ تو پاک ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک دَعُواهُمْ سے مراد اُن کا قول و قرار اور اُن کی پکار ہے۔

مقامِ مسرت

قُلْ بِفَضْلِ اللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذَلِكَ فَلْيَفْرَحُوا!

فرما دیجیے کہ اللہ کے فضل اور اُس کی رحمت پر خوشیاں مناؤ!

ابو مسلم کے نزدیک فضل اور رحمت سے اللہ کی مدد مراد ہے، اللہ نے بیان فرمایا کہ اگر

انہیں کامیابی نہ ملتی اور اللہ کی مدد حاصل نہ ہوتی تو مجانے کتنے دین سے پھر جاتے۔ صرف وہی لوگ دین پر قائم رہتے جو صاحب بصیرت اور صاحب عزم و استقلال ہوتے۔ جو یہ جانتے تھے کہ یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ حق کو اس دنیا میں حکومت حاصل ہو لیکن دلائل کی پختگی اور بار بار کی کامیابی اُس کے حق ہونے پر دلالت کرتی ہے۔

سورة هود

زفیر

قَامَا الَّذِيْنَ شَقُّوْا فِى النَّارِ لِهَمْ فِيْهَا رَزِيْرٌ

شَهِيْقٌ. (106:11)

جو بد بخت ہیں تو دوزخ میں اُن کے لیے چیخا اور چلانا ہوگا۔

ابو مسلم کے نزدیک زفیر اُس سانس کو کہتے ہیں جو سخت رونے کی وجہ سے اٹک جائے اور شہیق اُس آواز کو کہتے ہیں جو سخت مصیبت اور دکھ کے وقت ظاہر ہوتی ہے اور کبھی اس کے بعد غشی کی حالت طاری ہو جاتی ہے اور بعض اوقات موت آ جاتی ہے۔

سورة الرعد

محال کے معنی

وَهُوَ شَدِيْدُ الْمِحَالِ. (13:13)

اور وہ بڑی قوت والا ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک محال کے معنی سختی کے ہیں اس لیے قحط کے سال کو ”سنة المحل“ کہتے ہیں۔ محال، محل سے فعال کے وزن پر ہے اور فعال کا وزن عام طور پر مجاز اور مقابلہ کے لیے ہوتا ہے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ سخت غلبے والا ہے۔

سورۃ ابراہیمؑ

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مثیل موسیٰ علیہ السلام

وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا مُوسَىٰ بِآيَاتِنَا أَنْ أَخْرِجْ قَوْمَكَ مِنَ

الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ. (5:14)

ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم کو

اندھیرے سے روشنی کی طرف نکال لا۔

ابو مسلم فرماتے ہیں اللہ نے حضور کو قرآن حکیم عطا فرمایا تو کہا:

كِتَابٌ أَنْزَلْنَاهُ إِلَيْكَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ.

یہ کتاب آپ پر اتاری گئی تاکہ آپ لوگوں کو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے آئیں۔

اور موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا:

أَنْ أَخْرِجَ قَوْمَكَ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ.

تاکہ تو اپنی قوم کو ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے۔

مطلب یہ ہے کہ انبیاء کی بعثت کا مقصد واحد ہے، اور موسیٰ علیہ السلام اور سرور کائنات

کے پیغام میں اتنا فرق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو صرف اپنی قوم کو نور کی طرف لانے کا حکم ہوا ہے

لیکن حضور کی نبوت پوری نسل انسانی کے لیے ہے اور ان کا پیغام پوری انسانیت کو اندھیروں سے

نکال کر نور کی طرف لانے والا ہے۔

بَيِّنَات

جَاءَهُمْ رَسُولُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ فَرَدُّوْا أَيْدِيَهُمْ فِي

انبیا کھلے دلائل لے کر آئے تو انہوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ میں ڈال لیے۔

ابو مسلم کے نزدیک یسد سے مراد انبیا کے دلائل ہیں کیونکہ دلائل انبیا نسل انسانی کے لیے انعام عظیم ہیں، اور انعام کے لیے یسد کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، کہا جاتا ہے لفلان عندی ید (فلان کا مجھ پر بڑا احسان ہے)۔ ید کے لفظ سے بیعت اور وعدہ بھی مراد لیا جاتا ہے جیسے اللہ کا ارشاد ہے اِذْ يَبَايِعُونَكَ الخ (جو لوگ تجھ سے بیعت کر رہے ہیں وہ اصل میں اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اور تیرا ہاتھ اُن پر نہیں اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھ پر ہے)۔ پس وہ دلائل جو انبیاء بیان فرماتے تھے نعمائم اور احسانات تھے، تھوڑی تعداد کے لیے جمع ”ایسدی“ آتی ہے اور زیادہ تعداد کے لیے ”الایسادی“۔ پس انبیا کے دلائل کو ”ایسدی“ کا نام دینا زیادہ صحیح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وعدے جو زبانوں سے کیے جاتے ہیں وہ قبول نہ ہوں تو جہاں سے آئے اُدھر ہی اودھا دیے جاتے ہیں۔ جب قبول کی صورت ہو تو وعدے کی تکرار دوسرے منہ سے ہوتی ہے اور جب رد کرنا مقصد ہو تو جدھر سے آیا اُدھر ہی لوٹا دیا جاتا ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ”یسد“ کا اطلاق انگلی پر کیا جائے اور اس کا یہ مفہوم ہو کہ انہوں نے حیرانگی سے منہ میں انگلیاں ڈال لیں۔

ثمرات

فَاَخْرَجَ بِهِ مِنَ الثَّمَرَاتِ رِزْقًا لَّكُمْ. (32:14)

پھر اُس نے تمہارے لیے ثمرات سے رزق نکالا۔

ابو مسلم کے نزدیک ثمرات سے عام طور پر درختوں کے پھل مراد لیے جاتے ہیں لیکن زراعت اور نباتات کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ جیسے اللہ کا ارشاد ہے:

كُلُوا مِنْ ثَمَرِهِ إِذَا أَثْمَرَ وَآتُوا حَقَّهُ يَوْمَ حَصَادِهِ.

جب کھیتی پھل لائے تو کاٹنے کے روز اس کا حق ادا کرو۔

سورة الكهف

کتاب

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ
یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۚ قَیْمًا. (1:18)

سب تعریف اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب
اُتاری جس میں کوئی کجی نہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک ”یَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا“ اور ”قَیْمًا“ دونوں متواتر حال ہیں، اس
کا مفہوم یہ ہوگا کہ ”اپنے بندے پر کتاب نازل کی اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی۔“

سورة مریم

مواہی

وَ اِنِّیْ حِفْظُ الْمَوَالِیْ مِنْ وَّرَآئِیْ. (5:19)

اور میں اپنے بھائی بندوں سے اپنے پیچھے ڈرتا ہوں۔

ابو مسلم کے نزدیک مولا سے مراد مددگار، چچا کا بیٹا، مالک اور صاحب ہیں اور یہاں
اس سے مراد بیٹے کا قائم مقام ہے۔

رجم

لَیْسَ لَّہٗ تَنْتَہٗ لَا اَرْضٌ مِّمَّتْکَ. (16:19)

اگر تو باز نہ آئے تو میں تجھے دھتکار دوں گا۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ لَا دُجْمَنُکَ کے معنی پتھروں کے سنگ سار کرنے کے بھی ہیں اور یہ جلا وطن کرنے، ہانکنے اور دُور بھیجنے کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ نکال دینے یا ہانک دینے کی تائید وَاهْجُرْنِي مَلِيًّا سے بھی ہوتی ہے۔

سورہ طہ

اَکَادُ کا صحیح مفہوم

إِنَّ السَّاعَةَ آتِيَةٌ أَكَادُ أُخْفِيهَا. (15:20)

وہ گھڑی ضرور آنے والی ہے میں اُسے خفی رکھنا چاہتا ہوں۔

ابو مسلم کے نزدیک اَکَادُ سے مراد چاہتا ہے جیسے كَذَبْنَا يُوسُفَ (ہم نے یوسف کے لیے یہی چاہا)۔ عام طور پر کہتے ہیں لَا افْعَلْ ذَلِكَ وَلَا اَکَادُ (کہ میں ایسا نہیں کرنا چاہتا)۔

صلوٰۃ سے روکنا

فَلَا يَصُدُّنَكَ عَنْهَا مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا. (16:20)

سو تجھے اس سے وہ شخص نہ روکے جو اس پر ایمان نہیں لاتا۔

ابو مسلم کے نزدیک يَصُدُّنَكَ سے مراد صلوٰۃ سے روکنا ہے مَنْ لَا يُؤْمِنُ بِهَا میں ہا ضمیر قیامت کی طرف ہے، اور اس طرح کا استعمال لغت عرب میں جائز ہے کیونکہ عرب دو خبروں کو ملا دیتے ہیں اور پھر دونوں کا اکٹھا جواب دیتے ہیں اور سننے والوں کو حقیقت معلوم ہو جاتی ہے۔

قصہ سامری

قَالَ فَمَا خَطْبُكَ يَا سَامِرِيُّ. قَالَ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ

يَبْصُرُوا بِهِ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ أَثَرِ الرَّسُولِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذَلِكَ
سَوَّلْتُ لِي نَفْسِي. (95-96:20)

موسیٰ نے پوچھا کہ سامری تیرا کیا حال ہے؟ اُس نے کہا مجھے
وہ چیز دکھائی دی جو اوروں کو نہیں دکھائی دی تو میں نے فرشتے (کی
گھوڑی) کے نقش قدم کی (مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی پھر اُس (ڈھیلے
ہوئے پتھر سے میں) ڈال دیا اور میرے دل نے مجھ کو ایسی ہی صلاح
دی۔

مفسرین نے ان آیات پر ایک عجیب قصے کی بنیاد رکھی ہے، کہتے ہیں سامری کا اصل
نام موسیٰ تھا، اُسے بھی فرعون کے خوف سے غار میں ڈال دیا گیا تھا، وہاں جبرائیلؑ نے اُس کی
پرورش کی، ایک شعر ہے اس میں پہلے موسیٰ سے مراد یہی سامری ہے اور دوسرے موسیٰ سے حضرت
موسیٰؑ۔

فموسی الذی رباه جبریل کافر
و موسی الذی رباه فرعون مرسل
(ایک موسیٰ وہ تھا جسے جبرائیلؑ نے پالا مگر وہ کافر ہو گیا اور
ایک موسیٰ وہ تھا جنہیں فرعون نے پالا وہ پیغمبر بنے)۔

مفسرین بیان کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی تمام جماعت لے
کر راتوں رات مصر سے نکل آئے، فرعون نے لشکر لے کر اُن کا پیچھا کیا۔ جاتے جاتے جب بنی
اسرائیل دریا کے کنارے پہنچے تو حضرت موسیٰ کے معجزہ سے وہ پایاب ہو گیا اور سب لوگ پار اتر
گئے۔ مگر جب فرعون کنارے پر پہنچا تو کچھ ٹھنک گیا۔ مگر اللہ کو تو اُسے غرق کرنا مقصود تھا اس لیے
جبرائیلؑ علیہ السلام انسانی بھیس میں گھوڑی پر سوار ہو کر آئے اور دریا میں اتر گئے، فرعون کا گھوڑا
گھوڑی کو دیکھ کر شوخی کرنے لگا، اور فرعون کو لے کر گھوڑی کے پیچھے پانی میں اتر گیا، مصریوں نے
جب اپنے بادشاہ کو اترتے دیکھا تو سب لوگ اُس کے پیچھے ہو لیے اور منجدرہاں میں جا کر ڈوب

گئے۔ سامری کی پرورش جبرائیلؑ نے کی تھی لہٰذا وہ انہیں خوب پہچانتا تھا جب اُس نے دیکھا کہ جبرائیلؑ گھوڑی پر سوار جارہے ہیں تو گھوڑی کے نقش قدم کی مٹھی بھر مٹی اٹھالی اور جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لیے کوہ طور پر گئے تو سونے چاندی کے زیور، جو مصر سے باہر نکلنے کے قبل بنی اسرائیل کی عورتیں قبطیوں سے مستعار لے کر بھاگ آئی تھیں، سامری نے اُن سب کو اکٹھا کیا اور تمام زیوروں کو گلا کر ایک پتھر بنایا اور اُس کے جوف میں وہی مٹی ڈال دی جو جبرائیلؑ کی گھوڑی کے نقش قدم سے اُس نے اٹھائی تھی جس کی وجہ سے پتھر زندہ ہو گیا اور بولنے لگا۔ اس طرح کی بہت سی باتیں عرب کے یہودیوں میں مشہور تھیں، ظاہر ہے کہ یہ افسانے انہی کے ذریعہ سے تفاسیر میں بھر لیے گئے۔ قرآن کا دامن ان لغویات سے پاگ ہے مگر عجوبہ پرست مترجمین کتاب اللہ کے منہ میں بھی اپنی زبان ڈالنے کی کوشش کی ہے چنانچہ متذکرہ آیات کا ترجمہ شمس العلماء مولوی نذیر احمد صاحب سے سنیے:

”پوچھا کہ سامری تیرا کیا حال ہے؟ اُس نے کہا مجھے وہ چیز دکھائی دی جو آوروں کو نہیں دکھائی دی (جبرائیلؑ کو دیکھا کہ وہ گھوڑی پر سوار جارہے ہیں) تو میں نے جبرائیلؑ فرشتہ (کی گھوڑی) کے نقش قدم (کی مٹی) سے ایک مٹھی بھر لی پھر اُس کو ڈھلے ہوئے پتھرے میں ڈال دیا اور (اور بھائیں بھائیں کرنے لگا) اور (اس وقت) میرے دل نے مجھ کو ایسی ہی صلاح دی۔“

اب ابو مسلم کی تفسیر دیکھیے، فرماتے ہیں:

مفسرین جو بیان کرتے ہیں قرآن میں اس کی کوئی تصریح موجود نہیں یہاں ایک دوسری بات ہے اور وہ یہ ہے کہ لفظ رسول سے جبرائیلؑ نہیں بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مراد ہیں اور ”اَقْرَبُ الرُّسُلِ“ سے اُن کی سنت اور طریقہ مراد ہے جس کی پابندی کا انہوں نے حکم دیا تھا۔ جب کوئی کسی کے طریقہ پر کاربند ہوا کرتا ہے تو کہتے ہیں فلان

يقفوا اثر فلان و يقبض اثره يا فلان يقبض اثر فلان یعنی فلاں
 فلاں کی روش کی پیروی کرتا ہے اور اُس کے نقوش قدم پر چلتا ہے،
 مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ جب سامری کو ملامت کرنے لگے اور
 پوچھا کہ کیا بات تھی کہ کبو سالہ کے ذریعہ تو نے لوگوں کو گمراہ کر ڈالا تو اُس
 نے جواب دیا کہ بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَنْصُرُوا بِهِ مجھے وہ سوجھی جو کسی کو
 بھی نہیں سوجھی تھی، یعنی مجھے معلوم ہو گیا کہ تمہارا طریقہ درست نہیں، اے
 پیغمبر پہلے میں نے تمہارے اثر کو کچھ قبضہ میں کر لیا تھا یعنی تمہارے طریقہ
 و مذہب کا پابند تھا، پھر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ یہ سن کر حضرت موسیٰؑ نے
 اُسے بتایا کہ اس کا کیا انجام ہونے والا ہے اور دنیا و آخرت میں اُسے کیا
 عذاب ہوں گے۔ سامری نے رسول کہہ کر حضرت موسیٰؑ سے اس طرح کی
 باتیں کی تھیں جیسے کسی غائب کا تذکرہ ہو، اسی لیے مفسرین نے رسول سے
 جبرائیلؑ مراد لیے ہیں۔ لیکن اس سے حضرت موسیٰؑ ہی مراد ہیں، اور اس کی
 مثال ایسے ہے جیسے کسی بڑے آدمی سے کوئی اُس کے زور و کہے "اس
 معاملے میں امیر کا کیا حکم ہے۔" یا "فلاں مسئلہ میں بادشاہ سلامت کیا
 فرماتے ہیں۔" رہی یہ بات کہ سامری تو منکر تھا پھر اُس نے حضرت موسیٰؑ
 کو رسول کہہ کر کیوں مخاطب کیا؟ اس کی مثال یوں سمجھنی چاہیے کہ اللہ نے
 پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کفار کا یہ قول نقل کیا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْ
 نَزَلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ (اے وہ شخص کہ جس پر وحی اُتری
 ہے بے شک تو مجنون ہے) حالانکہ ان کافروں میں کوئی بھی پیغمبر صلی اللہ
 علیہ وسلم پر وحی اُترنے کا قائل نہ تھا۔

امام رازی نے اس مضمون کو حرف بحرف نقل کیا ہے اور پھر فرماتے ہیں:
 "واضح ہو کہ ابو مسلم کا یہ قول مفسرین کے اقوال کے خلاف تو

ہے لیکن یہ قول تحقیق کے بہت قریب ہے، اس کی کئی وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ حضرت جبرائیلؑ رسول کے نام سے مشہور نہ تھے اور نہ ہی اُن کا کہیں پہلے تذکرہ آیا ہے کہ اُن کے نام پر الف لام تعریف آتا اور اس سے جبرائیلؑ مراد ہوتے، الرسول کہنا اور اس سے جبرائیلؑ مراد لینا تو گویا علم غیب کی تکلیف دینا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس صورت میں ضمیر لانے کی ضرورت پڑتی ہے یعنی ”اثر حاضر فرس رسول“ (رسول کے گھوڑے کے سُم کا نشان) اور یہ ضمیر خلاف اصل ہے۔ تیسرے یہ کہ اس توجیہ میں ضرورت تکلف کرنا پڑے گا کہ تمام لوگوں میں ایک سامری نے ہی اکیلا جبرائیلؑ کو کیوں کر دیکھا اور پھر پہچان بھی لیا کہ یہ جبرائیلؑ ہیں، پھر اُسے یہ کیسے معلوم ہوا کہ جبرائیلؑ کی گھوڑی کے سُم کی مٹی میں یہ اثر ہے کہ وہ زیورات سے بنے ہوئے پھڑے کے پیٹ میں ڈالی جائے تو وہ بول پڑے گا۔ مفسرین کہتے ہیں کہ جبرائیلؑ نے سامری کو پالا تھا تو یہ اور بھی بعید از قیاس بات ہے۔ اگر سامری نے اُس زمانہ میں جبرائیلؑ کو پہچانا ہوتا جب اُسے پوری عقل آچکی تھی تو اُسے یہ بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سچے پیغمبر ہیں۔ اس صورت میں وہ گم راہ کرنے کا قصد کیسے کر سکتا تھا، اور اگر اُس نے بلوغ کے زمانہ میں جبرائیلؑ کو نہیں پہچانا تھا تو لڑکپن میں جبرائیلؑ کا اُس کو پالنا کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ چوتھی وقت یہ ہے کہ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ مٹی کی ایسی تاثیر سے اگر کفار واقف ہو سکتے ہیں تو معترض کو یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ عجب نہیں حضرت موسیٰ نے ایسی ہی تاثیر والی کوئی اور چیز پالی ہو اور اُسی کے اثر سے معجزات صادر ہوئے ہوں، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معجزات میں طعن کرنے کی ایک اور سبیل نکل آئے گی اور معترض یہ کہہ سکے گا کہ ممکن ہے انبیاء علیہم

السلام کو کوئی ایسی چیزیں مل گئی ہوں جن کی خاصیت سے معجزات صادر ہو سکتے ہوں۔ غرض یہ کہ یہ وہ صورت ہے کہ اگر افسانہ کو صحیح مانیں تو معجزات کا دروازہ بند ہو جائے۔ سامری کا یہ کہنا کہ ”كَذٰلِكَ مَسَّ لِيْ نَفْسِيْ“ (ایسا ہی میرے جی میں آیا) اس کا یہ مطلب ہے کہ میرے نفس نے جو تحریک کی میں اُسی پر کاربند ہوا۔ مَسَّ لِيْ سوال سے ماخوذ ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں نے کیا کسی دوسرے کی تحریک سے نہیں بلکہ اپنی خواہش نفس کی پیروی کی۔

سامری کا انجام

فَاذْهَبْ فَإِنَّ لَكَ فِي الْحَيٰوةِ اَنْ تَقُوْلَ لَا مِسَاسَ .
 دُور ہو دنیا میں تیرے لیے یہی عذاب ہے کہ کہے دیکھ مجھے

چھو نہ جانا۔

ابو مسلم کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ دنیا کی زینت اس سے چھین لی گئی یعنی اُس کی اولاد نہ ہوئی۔ لا مَسَاس کے معنی ملنے جلنے سے ممانعت کے بھی لیے جاسکتے ہیں، اس کی ضلالت دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اُسے حکم دے دیا کہ خبردار زندگی بھر کسی سے نہ ملنا۔

زَرْقًا کے معنی

يَوْمَ يُنْفَخُ فِي السُّورِ وَ نَحْشُرُ الْمُجْرِمِيْنَ يَوْمَئِذٍ

زَرْقًا. (102:20)

جس روز صور میں پھونکا جائے گا اور ہم اُس روز مجرموں کو

اکٹھا کریں گے جس روز اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔

ابو مسلم کے نزدیک زرقہ سے مراد اُن کی آنکھوں کا کھلا رہ جانا ہے۔ یہ آنکھ کی کمزوری ہے کہ وہ کھلی کی کھلی رہ جائے، اور یہ حال اُس شخص کا ہوتا ہے جو اپنا انجام دیکھ کر یا اچانک مصیبت کو

سامنے دیکھ کر خوف زدہ ہو جائے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اُس روز تک انہیں مہلت دے گا جس روز اُن کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گے۔

صَفْصَفًا کے معنی

فَيَنْزُرُهَا قَاعًا صَفْصَفًا. (102:20)

پس اُن کو صاف ہموار میدان کر چھوڑا۔

ابو مسلم کے نزدیک القاع الارض سے مراد زمین کی برابری اور ہمواری ہے اور یہی معنی صَفْصَفًا کے بھی ہیں۔

ظلم و ہضم

فَلَا يَخَافُ ظُلْمًا وَلَا هَضْمًا. (112:20)

تو اُسے نہ ظلم کا خوف ہو گا نہ حق تلفی کا۔

ابو مسلم کے نزدیک یہاں ظلم ثواب میں نقص کے معنوں میں آیا ہے اور ہضم کے معنی یہ ہیں کہ عظمتوں میں سے پورا حصہ نہ ملے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو مسلمانوں کی شان کے خلاف قرار دیا ہے۔

وسوسۂ شیطانی

فَوَسْوَسَ إِلَيْهِ الشَّيْطَانُ. (120:2)

پس شیطان نے اُس کی طرف وسوسہ ڈالا۔

ابو مسلم کے نزدیک وسوسۂ شیطانی سے دنیاوی مصالح میں نافرمانی مراد ہے اور (.....) کے بھی یہی معنی ہیں۔

قَالَ اهْبِطَا فِي تَنْثِيهِ اور جمع کی بحث

قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ فَإِنَّمَا

يَأْتِيَنَّكُمْ مِنِّي هَذِي.

فرمایا تم دونوں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ اس جگہ سے نکل جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو سوا گر میری طرف سے تمہارے پاس ہدایت آوے.....

ابو مسلم کے نزدیک یہاں خطاب آدم علیہ السلام اور اُن کے ساتھ اُن کی اولاد اور اہلبیس اور اُس کے ساتھ اُس کی اولاد سے ہے اور چونکہ یہ دو جنسیں ہیں اس لیے ”اٰہِطَا“ کا تثنیہ لانا جائز ہے اور دونوں جنسوں کی اولاد سے کثرت مراد لے کر فَاِمَا يٰۤاَتَيْنٰكُمْ میں جو جمع کا صیغہ استعمال ہوا ہے وہ بھی درست ہے۔

مدِّ عَیْن

وَلَا تَمْلُنْ عَیْنُكَ اِلٰی مَا مَتَعْنَا بِہِ. (131:20)

اور اپنی آنکھیں اُس کے پیچھے لمبی نہ کر.....

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اس سے آنکھ پھیلا نا مراد نہیں بلکہ ”مدِّ عَیْن“ کنایۃً افسوس کے لیے آتا ہے، یعنی جو کچھ تجھے اس دنیا میں نہیں ملا اور تیرے دشمنوں کو ملا ہے، اس پر افسوس نہ کر۔

رزق

نَحْنُ نَزِدُّكَ. (132:20)

ہم تجھے رزق دیتے ہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں چونکہ اس آیت کے پہلے حصے میں صلوٰۃ کا حکم ہے اس لیے یہاں رزق سے عبادت مراد ہے اور عبادت سے وہ فیکس مراد نہیں جو غلاموں سے مالک وصول کرتے ہیں۔ یہ صلوٰۃ انسان کے رزق روحانی کی حیثیت رکھتی ہے، اور یہی وہ رزق ہے جو آخر کار کام آتا ہے۔ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰی میں اسی طرف اشارہ ہے۔

سورة الانبياء

رتق وفتق

كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنَاهُمَا (30:21)

آسمان اور زمین دونوں بند تھے تو ہم نے انہیں کھولا۔

ابو مسلم کے نزدیک یہاں فتق سے ایجاد مراد ہے اور ایجاد سے پہلے کی حالت کو رتق سے

تعبیر کیا گیا ہے۔

آگ

قُلْنَا يَا نَارُ كُونِي بَرْدًا وَسَلَامًا عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ.

(69:21)

ہم نے کہا اے آگ ابراہیم پر ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔

ابو مسلم کہتے ہیں، یہاں آگ سے خطاب نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنا مراد ہے کہ اللہ نے

آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والا بنا دیا، اور خطاب کا طریقہ اس لیے استعمال کیا گیا کہ اللہ کا کسی چیز کو کسی

کام کے لیے خطاب کرنا دراصل اُس کام کے ہو جانے پر دلالت کرتا ہے چنانچہ فرمایا:

إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ.

جب وہ کسی کام کا ارادہ کرے تو ”کُنْ“ کہتا ہے اور کام ہو جاتا ہے۔

امامت سے مراد

وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يَهْتَدُونَ بِأَمْرِنَا (73:21)

ہم نے انہیں امام بنایا وہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے۔

ابو مسلم کے نزدیک یہاں امامت سے نبوت مراد ہے۔

الْإِيذَانُ عَلَى سَوَاءٍ کے معنی

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ اذْهَبْكُمْ عَلَى سَوَاءٍ ؕ (109:21)

پھر اگر پھر جائیں تو کہہ دے میں نے تمہیں انصاف کی بات

بتا کر خبردار کر دیا ہے۔

عام مفسرین کا خیال ترجمہ سے ظاہر ہے۔ ابو مسلم ”الایذان علی سواء“ سے ”لڑائی کے لیے اونچی آواز سے پکارنا“ مراد لیتے ہیں جیسا اس قول سے ظاہر ہے فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَى سَوَاءٍ۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں مشرکین کا لفظ مقدر تسلیم کرنا جائز ہے کیونکہ اسلام کی مخالفت میں اُن کی کوششیں شدید تھیں۔

تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ اگر وہ پھر جائیں تو کہیے کہ ”میں تمہیں مقابلہ کے لیے

بلاتا ہوں۔“

سورة الحج

بے علمی

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُجَادِلُ فِي اللَّهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَيَتَّبِعُ كُلَّ

شَيْطَانٍ مَّرِيدٍ . (30:22)

اور لوگوں میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو علم کے بغیر اللہ کے بارے میں جھگڑتا ہے اور ہر سرکش شیطان کے پیچھے چلتا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہ آیت ایسے بے علم لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو سرکش شیطان کی تقلید پر تو ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن اللہ کے آگے سر نہیں جھکاتے۔

غیظ

مَنْ كَانَ يَظُنُّ أَنَّ لَّنْ يَنْصُرَهُ اللَّهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

فَلْيُمْدِدْ بِسَبَبٍ إِلَى السَّمَاءِ ثُمَّ لْيَقْطَعْ فَلْيَنْظُرْ هَلْ يُذْهِبَنَّ

كَيِّدُهُ مَا يَعِظُ . (15:22)

جسے یہ خیال ہے کہ اللہ اس کی دنیا اور آخرت میں مدد نہیں کرے گا تو چاہے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ذریعہ سے آسمان پر لے جائے پھر اسے کاٹ دے پھر دیکھے کہ کیا اس کی تدبیر اس چیز کو دور کر دیتی ہے جو اسے غصہ میں لاتی ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک اس کے معانی یوں بھی ہو سکتے ہیں کہ نصرت الہی تو رسول کی تائید میں یقیناً ظاہر ہوگی، جو شخص اس بات پر ناراض ہو کہ یہ نصرت نبی کو کیوں مل رہی ہے تو چاہیے کہ وہ کسی ذریعہ سے آسمان پر پہنچ جائے اور اس نصرت کا رشتہ دنیا سے کاٹ دے۔ عام مفسرین نے

یہاں سَمَاء سے گھر کی چھت مراد لی ہے اور سبب کو ری قرار دے کر یہ معنی پیدا کیے ہیں کہ اللہ فرماتا ہے کہ ایسا شخص چھت سے لٹک کر خودکشی کر لے۔
وحی اور القائے شیطانی

وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا
تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ ۖ فَيَنْسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ
ثُمَّ يُعْكِمُ اللَّهُ إِلَيْهِ. (52:22)

اور اے نبی، تم سے پہلے ہم نے کوئی رسول ایسا بھیجا ہے نہ نبی
(جس کے ساتھ یہ معاملہ نہ پیش آیا ہو کہ) جب اس نے تمنا کی، شیطان
اس کی تمنا میں خلل انداز ہو گیا۔ اس طرح جو کچھ بھی شیطان خلل
انداز یاں کرتا ہے، اللہ ان کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو پختہ کر دیتا ہے۔

مفسرین اس آیت کی شان نزول میں یہ عجیب و غریب قصہ روایت کرتے ہیں کہ:
رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم پر جب کفار کے حالات گراں
گزرے تو آپ کو خیال ہوا کہ کاش کوئی ایسی آیت نازل ہوتی کہ قریش
کی نفرت ختم ہو جاتی۔ ایک روز آپ قریش کی محفل میں بیٹھے تھے کہ سورہ
”وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ“ اُتری اور آپ نے اسے پڑھنا شروع کیا، جب
ان آیات پر پہنچے اَفْرَيْتَ اللَّاتِ وَالْعُزَّىٰ وَمَنَاثَ الْوَعُورِ
تو شیطان نے آپ کی زبان سے جاری کراویا تِلْكَ الْغَرَائِيقُ الْعُلَىٰ
وَإِنَّ شَفَاعَتَهُمْ لَتَرْجَىٰ (یعنی ان نازک اندام اور عالی شان بتوں
سے شفاعت کی امید ہے)۔ قریش نے جب یہ سنا تو بہت خوش ہوئے۔
سورت کے آخر میں حضورؐ نے سجدہ کیا تو بس قریش نے بھی ساتھ ہی سجدہ
کیا۔ جبرائیلؑ نے حضورؐ سے کہا کہ آپ نے یہ الفاظ اپنی طرف سے کیوں
پڑھ دیے، تو حضورؐ ول میں بہت خوف زدہ ہوئے اس پر اللہ تعالیٰ نے زیر

یہ قصہ ابن ابی حاتم، طبری اور ابن منذر نے شعبہ کی سند سے اور بڑا رواہ ابن مردویہ نے اُمیہ بن خالد کی سند سے روایت کیا ہے اور وہ بھی شعبہ ہی سے روایت کرتے ہیں۔ ابن اسحاق نے محمد بن کعب، موسیٰ بن عقبہ نے ابن شہاب اور ابو معشر نے محمد بن کعب کی سند سے روایت کیا ہے، ابو بکر بن العربی نے بڑی جرأت سے کہا ہے کہ یہ قصہ لغو اور بے اصل ہے۔ قاضی عیاض نے کہا کہ اس کے ناقل ضعیف ہیں، روایات مضطرب ہیں اور سند منقطع ہے۔ محمد بن اسحاق بن خزیمہ نے اس قصہ کے متعلق کہا کہ اسے بے دینوں نے وضع کیا ہے۔ بیہقی نے اس کے سب راویوں میں کلام کیا ہے، اور سب کو ملعون قرار دیا ہے۔ مگر اس کو کیا کیجیے کہ ابن حجر اس کی صحت پر مصر ہیں۔

اصل میں تَحْنُی کے لفظ پر اتنی بڑی عمارت اُٹھائی گئی ہے کیونکہ مفسرین نے تمنا کے معنی تلاوت کے لیے ہیں اس لیے بعض اس طرف بھی گئے ہیں کہ اصل میں وہ الفاظ حضور کی زبان سے نہیں نکلے تھے بلکہ شیطان نے حضور کی آواز میں آواز ملا کر کہہ دیے تھے۔ جن لوگوں نے تمنا کو خواہش کے معنوں میں لیا انہوں نے کہا کہ حضور کی خواہش یہی تھی۔ ابو مسلم کہتے ہیں کہ آیت کہ معنی یہ ہیں کہ ہم نے انسانوں کے لیے انہیں میں سے انبیاء بھیجے فرشتے نہیں بھیجے گئے اور کوئی پیغمبر ایسا نہیں کہ وحی کی تلاوت میں شیطانی وسوسہ سے بچا ہو۔ شیطان اس کے ذہن میں وحی کے منافی باتیں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے مگر اللہ تعالیٰ اس کی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیتا اور نبی کو وحی اور حفظ وحی پر ثابت قدم کرویتا ہے۔ اس کی مثل یہ دوسری آیت ہے:

إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِّنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ.

پرہیزگاروں کو جب شیطان کے کسی گروہ نے چھو لیا (یعنی بُرے خیالات اُن کے دلوں میں پیدا کیے) تو انہوں نے اللہ کو یاد کیا یا دکر نا تھا کہ ناگاہ بصیرت والے ہو گئے۔

أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّ

ذَلِكَ فِي كِتَابٍ ط (70:22)

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین

میں ہے یہ سب کچھ کتاب میں ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک کتاب کے معنی حفظ اور ضبط کے ہیں پس اللہ کے اس قول سے یہ

مراد ہے کہ یہ سب کچھ (علوم ارضی و سماوی) اللہ کے حفظ و ضبط میں ہے۔

سورۃ مومنون

كِتَابٌ يُنْطَقُ بِالْحَقِّ

وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يُنْطَقُ بِالْحَقِّ (62:23)

ہمارے پاس کتاب ہے جو سچ بولتی ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ نیک لوگوں کی صفات بیان کرنے کے بعد یہ آیت لائی گئی جس

میں بتایا گیا اور یہاں بھی کتاب سے مراد علم الہی ہے۔ ربط آیات اس طرح ہے کہ پہلے مشفقین کی

صفات بیان فرمائیں اور ان کے اعمال واضح طور پر بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ یہ نیکیاں وہ اس

لیے کر رہے ہیں کہ اللہ کسی آدمی کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا اور پھر نیکیوں کا پورا پورا بدلہ دیتا

ہے اور کچھ بھی کمی نہیں کی جاتی۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ ربط بالکل صحیح ہے اور اس ربط کی نسبت

بہتر ہے جس اس آیت کو بعد کی آیت سے دیا جاتا ہے۔

شکر

قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (78:23)

بہت ہی کم تم شکر کرتے ہو۔

ابو مسلم کہتے ہیں پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتیں گنوائیں اور بتایا کہ اللہ نے تمہیں سماعت و بصارت اور افہام دیے یعنی حواس ظاہری و حواس باطنی عطا فرمائے پھر فرمایا **قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ** اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم شکر تو ادا کرتے ہو مگر تھوڑا بلکہ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم شکر ادا ہی نہیں کرتے جیسے کسی منکر نعمت کو کہا جاتا ہے اقل شکر فلان۔

ذَرَأَتْكُمْ كَامَطْلَب

وَهُوَ الَّذِي ذَرَأَكُمْ فِي الْأَرْضِ

اور وہی جس نے تمہیں زمین میں پھیلایا۔

ابو مسلم کے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں اولاد و ذرا و لا زیادہ کیا کیونکہ

”ذَرَأَ“ سے ہی **ذُرِّيَّتٌ** کا لفظ ہے۔

شِقْوَتٌ کا مفہوم

قَالُوا رَبَّنَا غَلَبَتْ عَلَيْنَا شِقْوَتُنَا (106:23)

کہیں گے اے رب ہمارے ہم پر بد بختی غالب آئی۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ شقوت کا مصدر الشقاء ہے جیسے حرية کا مصدر

جری ہے۔ بعض اوقات لفظ بطور فعل آتا ہے لیکن اس سے حالت مراد ہوتی ہے جیسے جلسہ،

حسنہ، ركبہ، قعدہ اور یہ حالتوں کا اظہار ہے اور کہا جاتا ہے کہ ”عاش فلان عيشة طيبة

ومات ميتة كريمة“ یعنی فلاں نے بہت ہی سکون کی زندگی بسر کی اور عزت کی موت مرا، اسی

طرح شقوت سے مراد بد بختی کی حالت ہے۔

رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْكَرِيمِ

اُس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ معزز عرش کا رب ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ عرش یہی آسمان ہیں جن کے گرد ملائکہ طواف کرتے ہیں، اور اس

سے عظیم سلطنت بھی مراد لی جاسکتی ہے۔

سورة النور

آیات بینات

فِيهَا آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ (1:24)

اس میں آیات بینات ہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک آیات بینات سے وہی احکام و حدود مراد لیے جاسکتے ہیں جو اس سورت میں بیان کیے گئے ہیں۔

نکاح کے معنی

الزَّانِي لَا يَنْكِحُ إِلَّا زَانِيَةً أَوْ مُشْرِكَةً وَالزَّانِيَةُ لَا يَنْكِحُهَا إِلَّا زَانٍ أَوْ مُشْرِكٌ وَحُرِّمَ ذَلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ. (3:24)

بدکار مرد سوائے بدکار یا مشرک عورت کے کسی سے تعلقات پیدا نہیں کرتا اور بدکار عورت سوائے بدکار مرد اور مشرک کے تعلقات پیدا نہیں کرتی اور یہ مومنوں پر حرام کیا گیا۔

ابو مسلم کہتے ہیں نکاح کا لفظ وطی پر بھی استعمال ہوتا ہے اس لیے ہو سکتا ہے کہ یہاں ”زانی“ اور ”زانیہ“ کے الفاظ کے قرینہ سے نکاح زنا کے معنوں میں استعمال کیا گیا ہو گیونکہ نکاح مسلمانوں پر حرام نہیں زنا حرام ہے۔

واقعه الفلک کا سب سے بڑا گناہگار

وَالَّذِي تَوَلَّى كِبْرَهُ مِنْهُمْ لَهُ عَذَابٌ عَظِيمٌ .

ان (واقعہ اقلک کے گنہگاروں) میں سے جس نے بڑا بوجھ

اپنے ذمہ لیا اُس کے لیے بڑا دکھ ہے۔

ابو مسلم کا قول ہے کبرہ کی اضافت اس لیے ہوئی کہ جس نے واقعہ اقلک کا الزام

تراشا، جس نے اسے پھیلایا یا اُسے اس گناہ کا بڑا شوق تھا۔

دنیاوی عذاب

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا

لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ. (19:24)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ بے حیائی کی مسلمانوں میں اشاعت ہو

اُن کے لیے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں دنیا کا عذاب یہی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اُن کے خلاف

جہاد کریں۔ ارشاد باری ہے جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنَافِقِينَ (کفار اور منافقین کے خلاف جہاد

کرو)۔

يَأْتِلُ کے معنی

وَلَا يَأْتِلُ أَوْلُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ.

اور تم میں سے صاحب فضل و وسعت لوگ یہ قسم نہ کھائیں کہ

(قریبیوں، مسکینوں اور مہاجرین کو کچھ نہ دیں گے)۔

مشہور معنی ترجمہ سے ظاہر ہیں، ان مفسرین کا خیال ہے کہ ”يَأْتِلُ“ الیہ سے ہے جس

کے معنی قسم کھانے کے ہیں لیکن ابو مسلم کو ان سے اختلاف ہے جس کی دو وجوہات ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ پھر آیت کے ظاہری معنی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ عطا کرنے

کی قسم کھانے سے منع کیا گیا ہے حالانکہ مقصد اس کے برعکس ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ عربی میں

افعلت، افعلت کی بجائے استعمال نہیں ہوتا اور حالت یہ ہے کہ الیت، الیۃ سے افعلت ہوا لیے افعلت نہیں کہا جائے گا جیسے التزم سے التزمت اور اعطیت سے اعطیت نہیں کہا جائے گا۔

یَاتِلِ اَصْل میں یا قلی ہے جزم کی وجہ سے ”ی“ محذوف ہوگئی ولا یاتل اور ولا یاتل دونوں ایک ہیں اور مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ نیکی میں کمی نہ کرو اور فعلت کی بجائے افعلت کا استعمال عام ہے جیسے کَسَبْتُ سے اکتسبت پس یہ صحیح تاویل ہے۔

ہدایت اور نور

يَهْدِي اللَّهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ ط

اللہ اپنے نور کے لیے جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک ہدایت کے تین درجے ہیں: (1) سیدھی راہ دکھانا (2) سیدھی راہ پر چلانا (3) منزل مقصود پر پہنچا دینا اور کامیاب کرنا۔

ہدایت کے پہلے معنی عام ہیں، دوسرے معنی کی طرف یہ آیت دلالت کرتی ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ (اے اللہ ہمیں سیدھی راہ پر چلائے رکھ)۔ تیسرے معنوں کی طرف وہ آیات اشارہ کرتی ہیں جن میں ہے کہ جتنی کہیں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي هَدَانَا لِهٰذَا ایک اور جگہ فرمایا:

اِنِّىْ لَغَفَّارٌ لِّمَنۡ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صٰلِحًا ثُمَّ

اَهْتَدٰى۔

میں اسی کے لیے بخشنے والا ہوں جس نے توبہ کی، ایمان لایا

اور صالح اعمال کیے پھر وہ کامیاب ہو گیا۔

اور نور سے مراد ہے انتہائی کامرانی و سرفرازی پس یہ آیت اُس آیت کی مثال ہے جس میں جنتیوں کے متعلق کہا گیا يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (ان کا نور رہنمائی کے لیے اُن کے

آگے ہوگا۔

خلال

فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ (41:24)

پھر تو بارش کو اُس کے اندر سے نکلتا دیکھتا ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک خلال جمع ہے خلل کی جیسے جبال، جبل کی جمع ہے اور پانی بادل کے پھٹنے سے برستا ہے۔

سورة الفرقان

افترا

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنَّ هَذَا إِلَّا إِفْكٌ

۱۰ افترہ (4:25)

اور کافر کہتے ہیں یہ تو زرا جھوٹ ہے جو اس نے گھڑ لیا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں افتر، فریت سے افتعال ہے۔ بُرائی کو ختم کرنا اور اس کا سر پکنا مقصود ہو تو کہا جاتا ہے افتریت و افتریت اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو کسی کو ایسی گالی دے یا کسی پر ایسی بات سے لعنت کرے جو فی الواقع اُس میں موجود نہ ہو تو ”افتری علیہ“ استعمال ہوتا ہے۔

ظلم و زور

فَقَدْ جَاءُوا ظُلْمًا وَ زُورًا (4:25)

پس وہ ظلم اور جھوٹ کے مرکب ہوئے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں اُن کا ظلم یہ ہے کہ انہوں نے رسول کی تکذیب کی اور زور اُس جھوٹ کو کہا گیا ہے جو حضور کے متعلق انہوں نے پھیلایا۔

قرآن نازل کرنے والا کون ہے؟

قُلْ أَنزَلَهُ الَّذِي يَعْلَمُ السِّرَّ فِي السَّمَوَاتِ
وَالْأَرْضِ. (6:25)

فرما دیجیے یہ کتاب تو اُس نے نازل کی ہے جو آسمان اور زمین کے بھیدوں سے واقف ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ قرآن تو اُس خدا نے نازل کیا جو زمین آسمان کے بھیدوں سے واقف ہے۔ پس اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی طرف سے آیات بنا کر اُس کی طرف منسوب کرتے تو وہ ضرور انتقام لیتا، کیونکہ اُس نے فرمایا ہے:

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضُ الْأَقَاوِيلِ لَأَخَذْنَا مِنْهُ
بِالْيَمِينِ وَقَطَعْنَا عُنَاهُ الْوُطِينَ.

اگر نبی بعض اقوال اپنی طرف سے گھڑ کر ہم سے منسوب کرتے تو ہم اُسے دائیں ہاتھ سے پکڑ لیتے اور اُس کی شہ رگ کاٹ دیتے۔

غفور رحیم

إِنَّهُ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا (6:25)

ہاں وہ بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ڈرانے اور سیدھی راہ پر چلانے کے لیے احکام نازل فرمائے تو ضروری ہے کہ وہ غفور رحیم ہو یعنی سزا دینے میں جلدی کرنے والا نہ ہو۔

جَنَّةُ الْخُلْدِ

قُلْ أَذِلَّكَ خَيْرٌ أَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ (15:25)

فرمائیے کیا یہ بہتر ہے یا ہمیشگی کا باغ۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ جنة الخلد وہ ہے جس کے نعيم ہمیشہ کے لیے ہیں۔ خلد اور خلود برابر ہیں جیسے شکر اور شکور۔

قول رسول

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوا هَذَا الْقُرْآنَ

مَهْجُورًا (30:25)

اور رسول نے کہا اے میرے رب میری قوم نے قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز کی طرح قرار دیا۔

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ قول دنیا میں واقع ہو چکا لیکن ابو مسلم کہتے ہیں کہ آخرت سے متعلق ہے۔ قیامت کے روز انبیاء کی گواہی لی جائے گی فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا (اور اس وقت کیا ہوگا جب ہر قوم پر گواہ آئے گا اور آپ کو بھی گواہ بنایا جائے گا)۔ اُس وقت حضور فرمائیں گے: ”اے میرے رب میری قوم نے قرآن کو چھوڑی ہوئی چیز قرار دیا تھا۔“

انبیاء کے دشمن

وَكَذَلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنْ

الْمُجْرِمِينَ (31:25)

اور اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے مجرموں میں سے دشمن

بنائے۔

ابو مسلم کے نزدیک ”عدو“ سے مراد دُور کا دشمن ہے نہ کہ نزدیک کا کیونکہ معاداة سے مباعدت (دُوری) کا مفہوم ظاہر ہوتا ہے جیسے نصر میں قربت کا مفہوم شامل ہے پس اللہ

نے مسلمانوں اور کافروں میں بُعد پیدا کر دیا۔

اصحاب الرّس

وَعَادَا وَثُمُودَ وَأَصْحَابَ الرّسِّ. (38:25)

اور عاد اور ثمود اور اصحاب الرّس۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ بلا و عربیہ میں ایک جگہ کا نام الرّس ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہی دادی ان لوگوں کی قرار گاہ ہو۔ عربی میں رس کے معنی دفن کرنے کے ہیں اور قبر کے گڑھے کو بھی رس کہتے ہیں۔ چنانچہ ”رس المیت“ کے معنی مردے دفن کرنے اور چھپا دینے کے ہیں۔ اس سے کنواں بھی مراد لیا گیا ہے، بہر حال جو کچھ بھی ہو اللہ نے اُن کی ہلاکت کی خبر دی ہے۔ یہ الفاظ نقل کر کے امام رازی فرماتے ہیں:

”جاننا چاہیے کہ ابو مسلم نے یہ بڑی پتے کی بات کی ہے کہ ان کے حالات نہ قرآن میں ملتے ہیں، نہ صحیح حدیث سے ثابت ہیں لیکن اُن کی ہلاکت کا سبب واضح الفاظ میں بتایا ہے کہ یہ اُن کے کفر کی وجہ سے تھی۔“

سبات

وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ لِبَاسًا وَالنَّوْمَ

سُبَاتًا. (27:25)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے رات کو پردہ اور دن کو موجب

آرام بنایا۔

ابو مسلم کا قول ہے کہ سبات سے آرام ہے اور اسی سے یوم السبت ہے یعنی آرام کا دن۔ جب بیمار کو بیماری کی تکلیف سے نجات ہوتی ہے اور آرام آ جاتا ہے اور اُسے مسبوت کہتے

ظہیر کا صحیح مفہوم

وَكَانَ الْكَافِرُ عَلَىٰ رَبِّهِ ظَهِيرًا (51:25)

اور کافر اپنے رب کے خلاف دوسروں کی پشت پناہی کرتا

ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ ظہیر کا صحیح مفہوم عربی کے اس محاورے میں پنہاں ہے ”ظہر فلان بحاجتی“ فلاں نے میری حاجت سے پیٹھ پھیر لی۔ اور اس پر قیاس لرتے ہوئے اس کے معنی خفیف اور متروک ہوئے۔

اثام کے معنی

وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ يَلْقَ أَثَامًا (68:25)

اور جو کوئی ایسا کرے وہ اپنے گناہ کی سزا پائے گا۔

ابو مسلم کہتے ہیں اِثم اور اِثام ایک چیز ہیں اور یہاں اِثام گناہوں کے بدلہ کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ کسی اسم کو اِثم کے بدل پر بھی اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

سورة القصص

فراغ کا مطلب

فَاصْبَحَ فُؤَادُ أُمِّ مُوسَىٰ فَارِغًا (10:28)

اور موسیٰ کی والدہ کا دل خالی ہو گیا۔

ابو مسلم کے نزدیک فراغ الفواد سے مراد خوف اور ڈر ہے۔

أَنَّمَا يُدْعُونَ إِلَى النَّارِ

وَجَعَلْنَاهُمْ أُمَّةً يُدْعُونَ إِلَى النَّارِ (41:28)

اور ہم نے انہیں آگ کی طرف بلانے والے پیش رو بنایا۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ امامت سے مراد تقدم ہے جب اللہ نے اُن پر عذاب نازل کیا تو وہ

اپنے بعد میں آنے والے کفار کے لیے متقدمین کا درجہ رکھتے ہیں۔

مفتاح

وَاتَيْنَاهُ مِنَ الْكُنُوزِ مَا إِنَّ مَفَاتِحَهُ لَتَنُوءُ بِالْعُصْبَةِ

أُولَى الْقُوَّةِ. (76:28)

اللہ نے اُسے اتنے خزانے دیے کہ اُس کے خزانے ایک

طاقت ور جماعت کے لیے اٹھانے مشکل تھے۔

ابو مسلم کے نزدیک مفتاح سے مراد چابیاں نہیں بلکہ احاطہ مراد ہے۔ گویا یہ بیان کیا گیا

کہ ہم نے اُسے اس قدر خزانے دیے کہ اُن کی حفاظت اور احاطہ کے لیے ایک طاقت ور جماعت

کی ضرورت تھی۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اس کی قوم میں ایسے لوگ بھی تھے جنہوں نے اُسے کئی

امور کے متعلق نصیحتیں کی تھیں۔ پہلی نصیحت یہ تھی کہ اسے اپنی دولت پر مغرور نہیں ہونا چاہیے کیونکہ

اللہ تکبر کو پسند نہیں کرتا۔ دنیاوی مال و دولت کا خمار اُسی کو اندھا کرتا ہے جو یہ گمان کر بیٹھتا ہے کہ اب کوئی طاقت مجھے دولت کے ان ڈھیروں سے جدا نہیں کر سکتی، اور جسے معلوم ہو کہ اس کی ساری دولت دھری رہ جائے گی اور وہ بھرے پُڑے خزانے چھوڑ کر خالی ہاتھ چلا جائے گا تو وہ اس دولت سے خوش نہیں ہوتا۔

متنبی نے کیا خوب کہا ہے :

اَشَدُّ الْغَمِّ عِنْدِي فِي سُرُورٍ

تَيَقَّنَ عَنْهُ صَاحِبُهُ انْتِقَالًا

(میرے نزدیک عیش و نشاط شدید ترین غم ہے کیونکہ صاحب

سرور کو یقین ہوتا ہے کہ وہ دیر پا نہیں)۔

ابن عباس کہتے ہیں کہ اس کی یہ مسرت و انبساط بھی شرک تھی کیونکہ اس کے ساتھ اس کو

اللہ کی سزا کا خوف نہ تھا۔

سورة الصّٰفّٰت

وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا كَـمَعْنٰی

وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا (1:37)

گواہ ہیں صف باندھنے والی جماعتیں۔

مفسرین نے اس سے فرشتے مراد لیے ہیں مگر ابو مسلم کہتے ہیں اس لفظ کا ملائکہ پر محمول کرنا جائز نہیں کیونکہ یہاں تائید آئی ہے اور ملائکہ اس صفت تائید سے پاک ہیں۔

سورة الزُّمُرِ

اَرْضُ اللّٰهِ

لِّلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً ط وَاَرْضُ اللّٰهِ

وَاسِعَةً . (10:39)

جن لوگوں نے بھلائی کی اُن کے لیے اس دنیا میں بھلائی ہے

اور ”ارض اللہ“ وسیع ہے۔

اگر یہاں ”ارض اللہ“ سے مراد اللہ کی زمین لی جائے تو بظاہر دونوں آیات غیر مربوط معلوم ہوتی ہے۔ اسی لیے ابو مسلم نے ”ارض اللہ“ سے جنت مراد لی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ”جس نے بھلائی کی تو دنیا میں اُسے بھلائی ملے گی۔“ اس کے بعد خود بخود ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے انہیں تو بھلائی ملی آخرت میں کیا ملے گا۔ پس آیت ”اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً“ سے یہی مراد لینی ہوگی کہ آخرت میں اُسے جنت ملے گی جو بہت وسیع ہے۔

سورة المؤمن

يَوْمَ الْآزِفَةِ کے معنی

وَأَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ.

انہیں موت کے دن سے ڈرا۔

ابو مسلم ”الْآزِفَةِ“ سے موت کا دن مراد لیتے ہیں۔ اللہ نے یوم قیامت کی صفت کے لیے ”یوم التلاق“ اور ”يَوْمَ هُمْ بَارِزُونَ“ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اس آیت میں فرمایا کہ انہیں الازفہ سے ڈراؤ، تو لازم ہے کہ آفہ سے قیامت کے بجائے کوئی اور دن مراد لیا جائے، جس طرح یہ آیات ہیں فَلَوْلَا إِذَا بَلَغَتِ الْحُلُقُومُ اور كَلَّا إِذَا بَلَغَتِ التَّرَاقِيَ تو ان سے قیامت کے بجائے موت کے دن مراد لینا زیادہ صحیح ہے۔

سورة الحديد

جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ

لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتِلْ أُولَئِكَ أَكْبَرُ

دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدِ وَقَاتِلُوا. (١٠: ٥٤)

تم میں سے وہ برابر نہیں کہ ایک نے فتح سے پہلے خرچ کیا اور دوسرے

نے فتح کے بعد..... الخ

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فتح سے پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی عظمت

بیان فرمائی ہے۔

ارْجِعُوا کا مفہوم

يَوْمَ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالْمُنَافِقَاتُ لِلَّذِينَ آمَنُوا
انظُرُونَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُورِكُمْ قِيلَ ارْجِعُوا وَرَاءَكُمْ فَالْتَمِسُوا
نُورًا. (۱۳: ۵۷)

جس روز منافق مرد اور منافق عورتیں مسلمانوں کو کہیں گے
ہمارا انتظار کرو ہم بھی تمہارے نور سے روشنی لیں گے کہا جائے گا اپنے
پیچھے کو لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو۔

ابو مسلم کے نزدیک ”ارْجِعُوا“ سے مراد منافقوں کو روشنی سے منع کرنا ہے جس طرح
کوئی شخص کسی ایسے آدمی کو جو اس سے قریب ہونا چاہے کہے ”وراءک او سع لک“ تیرے
پیچھے کی جگہ تیرے لیے زیادہ وسیع ہے۔ اس جگہ ”ارجعوا“ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مقصود
تک پہنچنے کی کوئی سبیل نہیں پائیں گے۔ امر مراد نہیں۔

سورة المجادلة

ظہار

وَالَّذِينَ يُظَاهِرُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ ثُمَّ يَعُودُونَ لِمَا قَالُوا
فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ يَتَمَاسَا. (۳: ۵۸)

اور جو لوگ اپنی عورتوں کو مائیں کہہ دیتے ہیں پھر اس کی
طرف واپس لوٹتے ہیں جو کہا تھا تو ایک غلام کا آزاد کرنا ہے اس سے پہلے
کہ وہ ایک دوسرے کو چھوئیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ عود کا لفظ اس مفہوم کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ غلام بھی آزاد کرنا ہو
گا جب وہ آدمی ظہار کے الفاظ میں قسم بھی کھائے کیونکہ جو آدمی یہ کہے کہ ”فلاں چیز مجھ پر آدمی

کے گوشت کی طرح حرام ہے اور قسم نہ کھائے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں۔ اور جب قسم کھا کر یہی الفاظ دہرائے تو کفارہ لازم ہے۔

مَحَادَّة کا مفہوم

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ كُبِتُوا كَمَا كُبِتِ
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ. (۵:۵۸)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں ذلیل
کیے جائیں گے جس طرح ان کے پہلے مخالفت حق کرنے والے ذلیل
کیے گئے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ محادہ، حدید سے مفاعلہ اور اس سے مراد لوہے کے ہتھیاروں
سے مقابلہ کرنا ہے چاہے حقیقتاً تلوار سے جنگ کی جائے یا سخت جھگڑے کو اس سے تشبیہ دی
جائے۔ عام مفسرین اسے یعادون اور یشاقون کے مترادف سمجھتے ہیں جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر
ہے۔

سورة الملک

خدا کے متعلق کفار کا عقیدہ

أَمِيتُمْ مَنْ فِي السَّمَاءِ أَنْ يَخِفَّ بِكُمْ الْأَرْضُ

فَإِذَا هِيَ تَمُورُ. (16:67)

کیا تم اُس سے ڈر رہو جو آسمان میں ہے کہ وہ تمہیں زمین

سے نابود کر دے پس وہ اچانک کاٹنے لگے گی۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اہل عرب اللہ کے وجود کے قائل تھے مگر اُن کا اعتقاد یہ تھا کہ اللہ

آسمان میں ہے، جس طرح مسلمانوں کے ایک فرقہ مشتبہ کا عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ قطعی باطل ہے۔

خود اللہ کا ارشاد ہے وَهُوَ اللَّهُ فِي السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ۔ اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ اگر تم نے

اللہ کو آسمانوں میں مقید مان رکھا ہے اور اسی لیے ڈر رہو گے تو تو سمجھ لو کہ وہ تمہیں زمین میں بھی تباہ

کر سکتا ہے، وہ اگر چاہے تو زمین کاٹنے لگے۔

يَقُولُونَ كَا اِطْلَاقِ ماضی پر ہے

وَيَقُولُونَ مَتَى هَذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ

صَادِقِينَ. (25:67)

اور کہتے ہیں وعدہ کب ہے اگر تم سچے ہو۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ ”يَقُولُونَ“ میں مستقبل، حال اور ماضی کا احتمال ہو سکتا ہے۔

بہتر یہ ہے کہ یہاں ماضی مراد لیا جائے کیونکہ ان کے قول کے بعد اللہ اُن کی بات دُہرا کر کہہ رہا

ہے کہ ”اے نبی کہہ دیجیے اس کا علم اللہ کے پاس ہے۔“ گویا يَقُولُونَ کی تقدیر یوں ہوگی

”وَكَانُوا يَقُولُونَ“۔

سورة القلم

کشف ساق

يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى السُّجُودِ فَلَا

يَسْتَطِيعُونَ. (42:68)

جس روز شدت ظاہر ہوگی وہ سجدے کے لیے بلائے جائیں

گے، پس نہ کر سکیں گے۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ اس آیت کو قیامت کے روز پر محمول کرنا قطعاً ناجائز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اُس دن کی صفت میں فرمایا ہے کہ وہ سجدہ کرنے کے لیے پکارے جائیں گے اور عبادت کا مکلف تو انسان دنیا میں ہے، قیامت میں نہیں ہوگا۔ بلکہ اس سے مراد دنیا کا آخری دن یا موت کا دن ہے کیونکہ تم دیکھتے ہو کہ نزع کے وقت بھی صلوٰۃ کی طرف پکارا جاتا ہے، اذان ہوتی ہے، حی علی الصلوٰۃ کی منادی سے اُن کو مسجد میں بلایا جاتا ہے مگر وہ صلوٰۃ ادا نہیں کر سکتے۔ وہ وقت ہی ایسا ہے کہ ایسے وقت میں کسی شخص کے لیے خدا پر ایمان لانا بھی مفید نہیں ہو سکتا۔

اور يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ کے معنی شدتِ امر کے ہیں:

وَعَنْ عِكْرَمَةَ فِي قَوْلِهِ يَكْشَفُ عَنْ سَاقٍ قَالَ هُوَ

يَوْمَ كَرْبٍ.

عکرمہ سے روایت ہے کہ ”یوم یکشف عن ساق“

سے مراد یوم کرب ہے۔

پس ایسی شدت کرب کی حالت میں عبادت کا کس کو خیال رہتا ہے اور ایسے وقت کا

ایمان کیا نفع دے سکتا ہے۔

علامہ رازی لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج نہیں کہ اس روز سے قیامت کے روز کی بجائے موت کا دن مراد لیا جائے، جیسا کہ ابو مسلم نے کہا ہے۔

سورة الحاقة

الحاقہ کے معنی

الْحَاقَّةُ. (1:69)

حق ہونے والی۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ الْحَاقَّةُ، حَقَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ سے الفاعلہ کے وزن پر

ہے۔

سورة المعارج

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ کا مفہوم

تَعْرُجُ الْمَلَائِكَةُ وَالرُّوحُ إِلَيْهِ. (4:70)

فرشتے اور روح اُس کی طرف چڑھتے ہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک اس دن سے دنیا کی ابتدا اور انتہا مراد ہے یعنی ازل سے اب تک ملائکہ کا عروج و نزول جاری رہے گا اور اس دن کی مقدار پچاس ہزار سال ہے لیکن یہ لازم نہیں آتا کہ قیامت کا وقت معلوم ہو کیونکہ ہم نہیں جانتے کہ کتنا عرصہ گزر گیا اور کتنا باقی ہے۔

سورة الدھر

نذر

يُؤْفُونَ بِالْأَنْذَرِ. (7:76)

وہ نذر پوری کرتے ہیں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہ لفظ بندوں کی طرف سے ہو تو اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے اوپر فرض کر لینا، جیسے عام طور پر نذر مانی جاتی ہے کہ ”اگر مجھے فلاں گم شدہ چیز مل گئی تو اتنا صدقہ کروں گا۔“ اللہ کی طرف سے یہی لفظ وعدے کے معنوں میں آتا ہے۔ پھر مفسرین میں اس کے مضداق کے متعلق اختلاف ہے، مثلاً کوئی کہتا ہے کہ ”اگر فلاں آدمی گھر میں داخل ہو تو مجھ پر یہ چیز لازم ہوگی۔“ چونکہ اس میں نیکی کا کوئی پہلو نہیں اس لیے بعض لوگ نذر سمجھتے ہیں اور بعض قسم۔

سورة المرسلات

ظِلّ

انْطَلِقُوا إِلَى ظِلِّ ذِي ثَلَاثِ شُعَبٍ. (30:77)

تین شاخوں والے سائے کی طرف چلو۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہاں درختوں کا سایہ مراد نہیں بلکہ اس سے مراد دھوئیں کا سایہ ہے۔ آگ کے کسی بہت بڑے الاؤ سے جب دھوئیں کے بادل اُٹھتے ہیں تو وہ مختلف شاخوں کی طرح معلوم ہوتا ہے اور خیمہ کی طرح اوپر تن جاتا ہے۔ تین طرح پھوٹنے والے سایہ سے گویا جہنم کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے اس آگ کا دھواں مختلف اطراف میں پھیل رہا ہے اور وہ لپکی چلی آ رہی ہے۔

بعد کی آیات بھی اسی مفہوم پر دلالت کرتی ہیں:

لَا ظَلِيلٍ وَلَا يُغْنِي مِنَ اللَّهَبِ.
جس میں نہ چھاؤں ہے نہ شعلوں کی لپٹ سے بچاؤ۔

سورة النزعت

النزعت کے معنی

وَالنَّزْعَتِ غَرْفًا.

گواہ ہیں ڈوب کر نکال لینے والی۔

جن لوگوں نے ”النزعت“ سے فرشتے مراد ہیے ہیں، ابو مسلم نے اُن کی سخت تردید کی ہے اور کہا ہے النازعات، نازعہ کی جمع ہے اور یہ لفظ مونث کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور ملائکہ کو خود خدا تانیٹ کی صفت سے پاک قرار دیتا ہے جب کفار کی اس بات کی تردید کی کہ وہ انہیں اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں۔

اصل میں یہ آیات مجاہدین کی تعریف میں ہیں اور ”النازعات“ سے مراد مجاہدین کے ہیں جیسے تیر چلانے والے کو کہتے ہیں ”نزع فی قوسہ“ اسی طرح ”اغرق فی النزاع“ کا مفہوم ہے اُس نے کمان کا چلہ چڑھایا۔ ”نَاسِطَات“ کے معنی تیروں کا تیر چلانے والوں کے ہاتھ سے نکلنا ہے۔ ”نَاسِطَةٌ“ کا لفظ ہر اُس چیز کے لیے جسے حلال کیا گیا ہو۔ نشاط بھی اسی سے ہے جس سے خوشی مراد لی جاتی ہے۔

”السَّابِحَات“ سے مراد گھوڑے ہیں اور اس سے اونٹ بھی مراد لیے جاسکتے ہیں اور مدبرات کے معنی ”مُعَقَّبَات“ ہیں، اور مراد یہ ہے کہ اس کے پیچھے بدو شامل ہے یعنی تیر چلانے اور گھوڑے دوڑانے کے بعد اللہ کی تائید و نصرت آئے گی، یہاں تانیٹ اس لیے استعمال ہوئی کہ تمام صفات جماعتوں کی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ ”مُدَبِّرَات“ کمانوں کی ڈوریوں کے لیے استعمال ہوا ہو۔

اور یہ قیامت کے علامات نہیں اس لیے ”الرّاجفہ“ کے معنی مشرکوں کے گھوڑے اور ”الرّادفہ“ سے مشرکوں کے گروہ مراد ہیں۔ ”القلوب الواجفہ“ کے معنی قلعے اور ”الابصار الخاشعة“ کے معنی منافقوں کی آنکھیں ہیں جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے:

الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَّرَضٌ يَنْظُرُونَ إِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشَىٰ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ.

جن لوگوں کے دلوں میں بیماری ہے وہ اس طرح تیری طرف دیکھتے ہیں جیسے اُن پر موت کی غشی طاری ہو۔

ان آیات کا مطلب یہ ہوا کہ جب دشمنوں کے گھوڑے قطار اندر قطار آنے لگے تو منافقوں کے دل مضطرب ہو گئے، اُن کی آنکھیں بزدلی سے زمین میں گر گئیں تو پھر انہوں نے کہا:

إِنَّا لَمَرْدُودُونَ فِي الْحَافِرَةِ.

یعنی کیا ہمیں اُلٹے پاؤں لوٹایا جائے گا یا ہم یہ خوف برداشت کریں گے۔

پھر کہا:

تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ.

ہائے اس لوٹنے میں بھی نقصان ہے۔

گویا پہلے مشرکین کی لڑائی کا حال بیان ہوا پھر کلام کا رخ منافقوں کے حال کی طرف پھیرا گیا اور آخر میں منافقوں کے اقوال بیان ہوئے۔ پھر اللہ نے انہیں جواب دیا:

فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ.

وہ تو صرف ایک ڈانٹ ہوگی اور وہ ایک میدان میں ہوں گے۔

علامہ رازی کہتے ہیں، یہ ابو مسلم کے اقوال ہیں۔ اگرچہ جمہور مفسرین کے خلاف ہیں لیکن قرآن کی آیات میں ان معانی کا احتمال بھی ہے۔

سورۃ عبس

تیسیر

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسْرَهُ .

پھر راستہ اُس کے لیے آسان کر دیتا ہے۔

ابو مسلم کے نزدیک ”وَهْدَيْنُهُ النَّجْدَيْنِ“ اور یہ آیت ہم معنی ہیں۔ راستہ آسان کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ دونوں راستے واضح کر کے دکھا دیتا ہے کہ یہ حق کی راہ ہے اور یہ باطل کی، اور تیسیر کے لفظ میں اختیار و ارادہ، بعثت انبیاء اور کتابوں کا بھیجنا سب شامل ہے۔

سورۃ الانفطار

ابتدائی عمر اور آخری عمر کے گناہ

عَلِمْتُ نَفْسٌ مَا قَدَّمْتُ وَآخَرْتُ کا مفہوم ابو مسلم کے نزدیک یہ ہے کہ پہلی اور آخری عمر کے گناہ معلوم ہو جائیں۔

سورة التطفیف

قیامت کا بیان

يَوْمَ يَقُومُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ. (7:83)

جس دن لوگ جہانوں کے رب کے سامنے کھڑے ہوں

گے۔

ابو مسلم اس آیت کو ”قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِينَ“ کا مترادف قرار دیتے ہیں۔ پس مطلب یہ ہوا کہ اُس روز تمام نسل انسانی اللہ کے حکم سے اُنٹھ کھڑی ہوگی، یہ مطلب نہیں کہ اللہ اُن کے سامنے بیٹھا ہوگا۔

حجاب

يَوْمَنذِلْهُمْ حُجُوبًا. (17:83)

جس روز وہ اوچھل ہوں گے۔

ابو مسلم کے نزدیک ”محجوبون“ کے معنی ہیں دُور ہونے والے، غیر مقرب اور حجاب رد کے معنوں میں آتا ہے اور یہ قبول کی ضد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منکرین اللہ کا تقرب حاصل نہیں کر سکیں گے اور انہیں اس کے دربار میں قبولیت حاصل نہیں ہوگی۔ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ (نہ اللہ ان سے کلام کرے گا نہ دیکھے گا) کا بھی یہی مفہوم ہے کہ ان کے اعمال کو اللہ کے ہاں ”قبولیت“ حاصل نہیں ہوگی۔

عَلِيْنَ

إِنَّ كِتَابَ الْأَنْبَرِ لَفِي عِلِّيْنَ. (19:83)

نیکوں کے اعمال بلند مقام پر ہیں۔

ابو مسلم کے نزدیک کتاب سے مراد کتابت ہے، پس معنی یہ ہوئے کہ نیکوں کے اعمال کی کتابت علیین میں ہوگی۔ پھر علیین کی تعریف فرمائی کہ وہ ایک کتاب ہے جس میں تمام صلحاء کے اعمال لکھے ہیں (کِتَابُ مَرْقُوم)۔

سورة الاعلیٰ

اسم

سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى. (1:85)

اپنے بہت بلند رب کے نام کی تسبیح کر۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ یہاں اسم سے مراد یہی صفت ”الاعلیٰ“ ہے کیونکہ اسما صفت کو کہتے ہیں ”وَلِلّٰهِ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنٰی“۔

سورة البینہ

بینہ کا مفہوم

حَتَّى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ. (2:98)

حتیٰ کہ اُن کے پاس کھلی دلیل آئی۔

ابو مسلم کے نزدیک بینہ رُسل کو کہا گیا ہے اور یہاں یہ مراد ہے کہ اُن کے پاس فرشتوں میں سے رسول آئے اور مقدس صحائف پڑھے۔

حُفَّاء کے معنی

حُفَّاءٌ وَيُقِيمُوا الصَّلَاةَ وَيُؤْتُوا الزَّكَاةَ.

راست رو ہوں اور صلوٰۃ قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ ”حنف فی الرجل“ کے معنی ہیں پاؤں کے اندر کی طرف ٹیڑھا کرنا۔ اور وہ اس طرح کہ پاؤں کے انگوٹھوں کو انگلیوں کے پیچھے اس طرح لے جایا جائے کہ دونوں انگوٹھے آپس میں مل جائیں۔ پس حنیف وہ ہوا جس نے تمام ادیان سے منہ موڑ لیا ہو اور صرف اسلام کا ماننے والا ہو۔

سورة التكاثر

کفار سے خطاب

الْهٰنُكُمُ التَّكَاثُرُ. (1:102)

کثرت مال کی خواہش نے تمہیں غافل کر رکھا ہے۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ اللہ قیامت کے روز اسی طرح کفار کو مخاطب کرے گا کیونکہ اُس وقت وہ قبروں میں رہ چکے ہوں گے۔

سورة الفيل

عَصْفِ مَأْكُولِ کے معنی

كَعَصْفِ مَأْكُولِ. (5:105)

کھائے ہوئے بھس کی طرح۔

ابو مسلم کہتے ہیں کہ عصف بھوسے کو کہتے ہیں جسے ہوا غلہ سے جدا کرتی ہے۔ پس اگر وہ کھایا ہوا ہو تو اس میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

سورة الكوثر

فَصَلِّ لِرَبِّكَ كَامِلًا

فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ. (2:108)

پس اپنے رب کے لیے صلوٰۃ قائم کر اور نحر کر۔

ابو مسلم کے نزدیک اس میں پانچوں فرض نمازیں مراد ہیں اور کیفیت کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ وہ پہلے سے معلوم تھی۔

سورة كُفِرُونَ

لفظ ”ما“ کی بحث

لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ. (2:109)

میں اُس کی عبادت نہیں کرتا جسے تم پوجتے ہو۔

ابو مسلم فرماتے ہیں کہ سورت کا مطلب یہ ہے کہ جنہیں تم پوجتے ہو میں ان بتوں کی پوجا نہیں کرتا، جس طرح تم اللہ کی عبادت نہیں کرتے۔ ”ما“ فعل کے ساتھ تاویل مصدر کے لیے ہے یعنی میں تمہارے جیسی عبادت نہیں کرتا جو شرک پر مبنی ہے اور نہ تم وہ عبادت کرتے ہو جو حق اور یقین ہے۔ پس اگر تمہیں یہ گمان ہے کہ تم اللہ کی عبادت کرتے ہو تو یہ گمان باطل ہے کیونکہ عبادت وہ ہے جس کا حکم دیا گیا ہو نہ یہ کہ جس سے منع کیا گیا ہو۔

سورة اللّٰهَب

تَبَّتْ يَدَاكَ مَفْهُوم

تَبَّتْ يَدَا أَبِي لَهَبٍ وَتَبَّ. (1:111)

ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہوئے اور وہ خود بھی ہلاک

ہوا۔

ابومسلم کہتے ہیں کہ ”تَبَّتْ يَدَا“ مال کا تباہ ہونا مراد ہے کیونکہ صاحب مال کو ”ذاتُ

الْيَدِ“ کہتے ہیں۔ اور تب سے اُس کا اپنا تباہ ہونا مراد ہے، جیسے کہا گیا:

”خَسِرُوا أَنْفُسَهُمْ وَآهْلِيهِمْ“

وہ خود بھی گھانے میں رہے اور اُن کے اہل بھی۔

حَمَالَةُ الْحَطَبِ کا مطلب

وَ أَمْرَأَتُهُ حَمَالَةَ الْحَطَبِ. (4:111)

اور اُس کی بیوی ایندھن اٹھانے والی۔

ابومسلم اور سعید بن جبیر کے نزدیک ”حَمَالَةُ الْحَطَبِ“ کے معنی گناہوں کا وہ بوجھ

ہیں جو اُس نے رسول کی عداوت میں اٹھایا، وہ بوجھ عذاب کی آگ کے لیے ایندھن کا کام دے

گا۔ حمل کا لفظ گناہوں کا بوجھ اٹھانے کے لیے اکثر جگہ استعمال ہوا ہے۔ جیسے ارشاد ہے:

فَقَدْ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُّبِينًا.

سورة الفلق

النَّفْثِ فِي الْعَقْدِ کے معنی

مِنْ شَرِّ النَّفْثِ فِي الْعَقْدِ (4:113)

گانٹھوں میں پھونکیں مارنے والوں کے شر سے (اپنے رب

کی) پناہ مانگتا ہوں۔

ابو مسلم کے نزدیک اس سے مراد وہ عورتیں ہیں جو مردوں کے عزائم میں عقدہ ڈالتی ہیں، اور یہ ”عقد حبال“ (رسیوں کی گانٹھ) سے استعارہ ہے۔ ”نفث“ اُس پھونک کو کہتے ہیں جس میں تھوک بھی شامل ہو۔ یہ رسی کی گانٹھ کو نرم کرنے کے لیے اس میں ڈالی جاتی ہے تاکہ اس کا کھلنا آسان ہو۔ پس آیت کے معنی یوں ہوئے کہ عورتیں حسن کی وجہ سے مردوں کے دلوں میں اتر جاتی ہیں، پھر انہیں اپنے تصرف میں لے آتی ہیں، پھر جدھر چاہیں اُن کے دل گھا سکتی ہیں۔ اس طرح مردوں کی آرا اور اُن کے عزائم بدلتے رہتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو اُن کے شر سے پناہ مانگنے کا حکم دیا جیسا کہ کتاب اللہ میں ہے:

إِنَّ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ وَأَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ

فَاخْذَرُوهُمْ.

بے شک تمہاری بیویوں اور اولاد میں سے تمہارے دشمن ہیں،

پس ان سب سے بچو۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ ابو مسلم کا یہ قول بہت عمدہ ہے اگرچہ اکثر مفسرین کے قول

کے خلاف ہے۔